خواتین کو آج بھی علاج معالجہ کے لئے کسی کلینک یا ہسپتال لے جانے کے بجائے روایتی طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ شہری علاقوں میں 71 فیصد اور دیہی علاقوں میں 44.4 فیصد زندہ بچوں کی پیدائش فراہمی خدمات کے ماہر افراد کی معاونت سے ہوتی ہے جبکہ تولیدی عمر کی خواتین (15 تا 49 سال) میں انیمیا کا تناسب پچاس فیصد سے کچھ زیادہ ہے۔[7] جسمانی صحت کے اشارئیے اپنی جگہ، خواتین کی ذہنی صحت مثلاً ڈپریشن اور ذہنی بے سکونی جیسے اشاریوں کو شاذ و نادر ہی دستاویزی شکل دی جاتی ہے۔ خواتین میں اوسط صحت مند عرصہ حیات اس وقت 58 سال ہے۔[8]

جدول 2: پاکستان میں خواتین کی تعلیم اور صحت کے اشارئیے

تعلیم	خواتین (فیصد)
شرح خواندگی	44
پرائمری میں داخلہ	68
سیکنڈری میں داخلہ	39
کالج، یونیورسٹی میں داخلہ	9
سکول سے باہر بچے	32
سکول سے باہر نوجوان	68

ذریعہ: ورلڈ اکنامک فورم (2017) "گلوبل جنڈر گیپ رپورٹ 2017"۔

بچوں میں چھوٹے قد کا مسئلہ بھی پاکستان میں خطرناک شکل اختیار کر چکا ہے۔ پاکستان کا شمار ان ملکوں میں ہوتا ہے جہاں پانچ سال سے کم عمر بچوں میں پستہ قد کی شرح بلند (44 فیصد) ہے۔ مردوں میں یہ زیادہ نمایاں یعنی 48 فیصد اور عورتوں میں 42 فیصد ہے۔ اس حوالے سے قابل ذکر عوامل میں ماؤں کی تعلیم اور گھرانے کی صحت شامل ہیں۔ زیادہ پڑھی لکھی خواتین کے بچوں میں چھوٹے قد کا تناسب صرف 21 فیصد ہے اس کے برعکس ان پڑھ ماؤں کے 55 فیصد بچے چھوٹے قد کا شکار ہیں۔ اسی طرح 62 فیصد پستہ قد بچوں کا تعلق غریب گھرانوں سے ہے جبکہ 23 فیصد انتہائی دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔[9]

گزشتہ چند دہائیوں میں صحت سے متعلق جن پالیسیوں اور پروگراموں کا اعلان کیا گیا ان میں حفظان صحت کے لئے خواتین عملہ کی دستیابی بڑھانے پر توجہ دی گئی لیکن دیہی علاقوں میں پہلے سے موجود سہولیات بہتر بنانے پر زیادہ زور نہیں دیا گیا۔ خواتین صحت کارکنوں کی مدد سے کام کرنے والے لیڈی ہیلتھ ورکرز پروگرام سے جہاں طبی خدمات رسائی میں آ گئی ہیں وہیں زچگی کے لئے ہسپتال نہ جانے کے کلچر میں کچھ خاص تبدیلی نہیں آئی۔ یہ پروگرام قبل از زچگی، بعد از زچگی وزٹ اور نومولود بچوں کی نگہداشت کی اہمیت پر خواتین میں کمیونٹی سطح پر شعور و آگاہی پیدا کرنے کی سرگرمیوں کی کمی کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ اگر ہم صحت کے اشاریوں میں نمایاں بہتری لانا چاہتے ہیں تو ان امور پر آگاہی پیدا کرنا ہو گی۔

سرکاری سکولوں میں مفت اور لازمی تعلیم (15 سے 26 سال) جیسی مراعات کے باوجود خواتین کے داخلہ کی شرح میں کوئی خاطر خواہ بہتری دیکھنے میں نہیں آئی۔ پرائمری میں بچیوں کی شرح داخلہ 68 فیصد ہے جبکہ سیکنڈری سطح پر 39 فیصد اور کالج، یونیورسٹی کی سطح پر 9 فیصد ہے (جدول 2)۔[10] خواتین کے معاملے میں دقت کے ساتھ ساتھ ان کی محرومی کا پہلو سکول سے باہر بچیوں کے تناسب یعنی 32 فیصد سے بالکل عیاں ہو جاتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ پریشان کن صورتحال نوجوان آبادی میں دیکھنے میں آتی ہے کیونکہ 58 فیصد نوجوان مرد اور پریشان کن حد تک 68 فیصد نوجوان خواتین سکول نہیں جاتیں۔ داخلہ نہ کرانے یا سکول چھوڑ جانے کی جو عام وجوہات بتائی جاتی ہیں ان میں فاصلہ، غربت، گھر کے کام، والدین سے اجازت نہ ملنا، نقل و حرکت کے مسائل وغیرہ شامل ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں جہاں گھرانے کی کم آمدنی کے پیش نظر آمدنی کمانے والے اضافی افراد کا ہونا ضروری ہے، پھر بھی کام کرنے یا تعلیم حاصل کرنے پر خواتین کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے یا سرے سے اجازت ہی نہیں دی جاتی۔ مزید برآں، اگرچہ حصول تعلیم سے آمدنی میں بہتری کی راہ ہموار ہوتی ہے لیکن تعلیم اور روزگار کے درمیان تعلق بھی کمزور ہے۔[11] بظاہر تعلیم حاصل کرنے والی کئی خواتین ایسے کیریئر نہیں اپناتیں جن کی بدولت تعلیم ان کے لئے ثمر آور ثابت ہو سکے۔ ان محرکین کی بناء پر یہ بات آج بھی انتہائی اہم ہے کہ خواتین کا معاشی سرگرمیوں میں انضمام ایک ایسا شعبہ ہے جس میں مزید مطالعہ اور تجزیہ کی ضرورت ہے۔

خواتین کو درپیش رکاوٹیں اور مشکلات

- سماجی روایات کی رکاوٹیں
- ناقص بنیادی ڈھانچہ (دیہی/نواحی علاقے)
- حفظان صحت کی خالی آسامیاں (دیہی)
- جغرافیائی رسائی یا طویل فاصلے اور ناقص نقل و حرکت۔

جغرافیہ اور سماجی تنوع پاکستانی معاشرے کی اہم خاصیتیں ضرور ہیں لیکن صنفی عدم مساوات بھی اس میں نمایاں ہے۔ خواتین کے بارے میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ان کا کام گھر میں رہنا ہے اس لئے ان کی تعلیم، صحت اور/یا روزگار کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ پدرشاہی سوچ پر مبنی اقدار آج بھی تمام سماجی طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین خواتین کی زندگیوں پر اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ تبدیلی آ رہی ہے لیکن تاحال اس نے معاشرے کے تمام طبقات پر اپنا اثر نہیں دکھایا۔ یکساں اہمیت کی حامل بات یہ ہے کہ دیہی (6.3 فیصد) اور شہری (3.6 فیصد) دونوں علاقوں کی نوجوان خواتین کو ہدف بنائیں اور ان پر اثر انداز ہوں۔ دیہی اور شہری علاقوں میں خواتین کو طرح طرح کی جو سماجی و مشکلات اس وقت درپیش ہیں انہیں دور کرنے کے لئے ایک طرف رسمی تعلیم کا دائرہ پھیلایا جائے تو دوسری جانب گلی محلے کی سطح پر کمیونٹی میں شعور و آگاہی پیدا کی جائے جس سے خواتین میں روزگار کا تناسب بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔ جسمانی و ذہنی صحت سے متعلق مسائل کے ساتھ ساتھ خواتین اور لڑکیوں پر تشدد کے مسائل کو دور کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے۔

اصولی طور پر تعلیم اور صحت کے شعبوں میں بہتری اتفاقیہ طور پر افراد کی بااختیار حیثیت سے جڑی ہے۔ لیکن پاکستان میں جو ایک روایتی معاشرہ ہے اور جہاں عدم برداشت اور سماجی تنزلی بڑھ رہی ہے، ضروری ہے کہ صوبائی حکومتیں ان دو سماجی شعبوں میں بنیادی نوعیت کی بہتری لانے کے لئے جی ڈی پی میں ان کا حصہ کم و بیش تین فیصد تک بڑھانے اور حفظان صحت کی خدمات تک خواتین کی رسائی بہتر بنانے پر توجہ دیں اور تعلیم کے شعبے میں جنوب مشرقی ایشیائی ممالک مثلاً ملائشیا کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں۔ تاہم اس سے آمدنی کی تقسیم کے اعتبار سے مختلف طبقات میں خواتین بااختیار نہیں ہو جائیں گی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خواتین اور لڑکیوں کو سماجی طور پر بااختیار بنانے کے لئے سازگار حالات بھی پیدا کرنا ہوں گے جو تبدیلی لانے کے لئے ایک بنیادی شرط ہے۔

7 نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پاپولیشن سٹڈیز (پاکستان) اور آئی سی ایف انٹرنیشنل (2013)۔ "پاکستان ڈیموگرافک اینڈ ہیلتھ سروے، 13-2012"۔ کالورٹن، میری لینڈ، امریکہ: نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پاپولیشن سٹڈیز اور آئی سی ایف انٹرنیشنل۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://www.nips.org.pk/abstract_files/PDHS%20Key%20Findings%20FINAL%201.24.14.pdf

8 ورلڈ اکنامک فورم (2017)، Global gender gap report 2017۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://www3.weforum.org/docs/WEF_GGGR_2017.pdf

9 نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پاپولیشن سٹڈیز-پلس (2013)، "پاکستان ڈیموگرافک اینڈ ہیلتھ سروے، 13-2012"۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://www.nips.org.pk/abstract_files/PDHS%20Final%20Report%20as%20of%20Jan%2022-2014.pdf

10 سپرا نوٹ 8

11 سوشل پالیسی اینڈ ڈویلپمنٹ سنٹر (2008)، Women at Work, Annual Review 2007-08۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://www.spdc.org.pk/Data/Publication/PDF/AR-9.pdf

سماجی شعبے کی کاروباری سرگرمیاں اور معاشی لحاظ سے بااختیار خواتین

ڈاکٹر وقار احمد

جوائنٹ ایگزیکٹو ڈائریکٹر
سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ پالیسی انسٹی ٹیوٹ

صنفی خلاء کے عالمی انڈکس میں کئی طرح کی سماجی و معاشی کیٹیگریز میں مردوں اور عورتوں کے درمیان پائے جانے والے خلاء کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور 2017 میں پاکستان اس انڈکس پر 144 ممالک میں 143 ویں نمبر پر رہا۔[1] آبادی کے لحاظ سے دنیا کے چھٹے بڑے ملک کے لئے اس طرح کے اعداد و شمار مستقبل میں سماجی بدنظمی کے امکان کو جنم دے سکتے ہیں۔ سرکاری اندازوں کے مطابق خواتین کی شرح خواندگی 48 فیصد ہے، اس کے مقابلے میں مردوں میں خواندگی کا تناسب 70 فیصد ہے۔[2] پرائمری سکولوں میں داخلے کا تناسب بچیوں میں صرف 51 فیصد ہے۔ آج پاکستان کی 30 فیصد سے بھی کم خواتین بامعاوضہ افرادی قوت میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔[3]

اجرتی اور ذاتی روزگار میں خواتین کی شمولیت کے اعداد و شمار یقیناً کچھ ایسے حوصلہ افزاء نہیں ہیں لیکن پاکستان میں سماجی شعبے کے کاروباری اداروں یا سوشل انٹرپرائزز کے میدان میں خاموش ترقی کا ایک عمل جاری ہے اور ان میں سے کئی ادارے ایسے ہیں جن کی مالک و منتظم خواتین ہیں۔ سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ پالیسی انسٹی ٹیوٹ (ایس ڈی پی آئی) کی طرف سے شائع کی گئی ایک حالیہ رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک بھر کی تمام سوشل انٹرپرائزز میں سے بیس فیصد کے لگ بھگ خواتین کی ملکیت یا قیادت میں کام کر رہی ہیں۔[4] یہ تناسب پاکستان کے روایتی نجی کاروباری اداروں کے مقابلے میں زیادہ ہے جہاں صرف پانچ فیصد ادارے خواتین کی ملکیت یا قیادت میں کام کر رہے ہیں۔ ان معلومات کی تصدیق برٹش کونسل کی طرف سے تیار کی گئی مطالعاتی رپورٹ سے بھی ہوتی ہے جس میں سامنے آیا کہ حالیہ عرصے کے دوران پاکستان میں سوشل انٹرپرائزز کے میدان میں قدم رکھنے والے نئے افراد کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے اور ان میں سے بیشتر سوشل انٹرپرائزز کی قیادت 35 سال سے کم عمر افراد کر رہے ہیں۔[5] ان سوشل انٹرپرائزز میں سے ہر پانچویں ادارے کی باگ ڈور کسی خاتون کے ہاتھ میں ہے۔ خواتین کی قیادت میں چلنے والی یہ سوشل انٹرپرائزز خواتین کو بااختیار بنانے کے اعتبار سے مثبت مضمرات کی حامل ہیں۔ چھوٹے اور درمیانے درجے کے کاروباری اداروں یا ایس ایم ایز کے مقابلے میں یہ سوشل انٹرپرائزز چار گنا کے لگ بھگ زیادہ خواتین کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ خواتین کی قیادت میں کام کرنے والی سوشل انٹرپرائزز میں خواتین کو بھرتی کرنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ ایس ڈی پی آئی کے ایک سروے سے سامنے آیا ہے کہ سوشل انٹرپرائزز کے شعبے کی 71 فیصد خواتین کے مطابق ان کے اعتماد میں اضافہ ہوا۔ تقریباً 62 فیصد خواتین کا کہنا تھا کہ سماجی شعبے میں کاروبار شروع کرنے سے ان کی ذاتی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔

تاہم ان سوشل انٹرپرائزز کو چلانے میں خواتین کو مشکلات بھی پیش آ رہی ہیں۔ بیشتر خواتین کے مطابق کام اور گھر کی ذمہ داریوں کے درمیان توازن برقرار رکھنا ان کے لئے ایک ایسا چیلنج ہے جس پر قابو پانا ان کے بس سے باہر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے کاروبار کو پھیلانے میں انہیں خاطر خواہ رکاوٹیں پیش آتی ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں: کاروباری مشورے یا مقامی سطح پر حکومتی معاونت کی کمی۔ ٹیکس، ماحولیات اور مزدور قوانین کی پاسداری میں مشکلات۔ ریگولیٹری بوجھ سے نمٹنے میں پیچیدگیاں (مثلاً میونسپل حکام سے پرمٹ اور لائسنس کا حصول)۔ باضابطہ ذرائع سے سرمایہ کی قلت۔ خواتین یا بڑی کاروباری تنظیموں کی طرف سے کمزور سرپرستی۔ اندرون و بیرون ملک اپنی مصنوعات کی مارکیٹنگ میں معاونت کی کمی۔ تجارت میں صنف سے متعلق بعض ایسی رکاوٹیں بھی ہیں جن پر کسی حکومتی یا غیر حکومتی پلیٹ فارم پر شاذ و نادر ہی بحث ہوتی ہے۔[6]

پاکستان اگر خواتین کو بااختیار بنانے کے لئے سماجی شعبے میں اپنے کاروبار کی سوچ یا سوشل انٹرپرینیورشپ کو اپنا بنیادی آلہ کار بنانا چاہتا ہے تو قانونی، پالیسی، ریگولیٹری اور ضابطے کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہوگا۔ ایس ڈی پی آئی کی رپورٹ میں قومی سطح کا سوشل انٹرپرائز ورکنگ گروپ قائم کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اس گروپ میں وفاقی و صوبائی حکومتوں، فیڈرل بورڈ آف ریونیو کے علاوہ ریگولیٹری اداروں مثلاً کمپیٹیشن کمیشن آف پاکستان، سکیورٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی باضابطہ نمائندگی ہونی چاہئے۔ ورکنگ گروپ میں سماجی شعبے اور تھنک ٹینکوں کے ارکان کو مدعو کیا جائے جو حکومت کو پاکستان میں سوشل انٹرپرائزز کے لئے وژن اور پالیسی فریم ورک کی تشکیل میں مدد دے سکیں۔

دوسرا، پلاننگ کمیشن میں سنٹر فار سوشل انٹرپرینیورشپ کا قیام ایک خوش آئند بات ہے۔ اس سنٹر کو قومی ورکنگ گروپ کے لئے سیکرٹیریٹ کا کام دینا چاہئے۔ وقت کے ساتھ یہ سنٹر پاکستان میں سوشل انٹرپرائزز کی باقاعدہ واضح تعریف طے کرنے کی کوشش کرے گا۔ مختلف ریگولیٹری فریم ورکس اور مرکزی بینک کے قواعد و ضوابط میں سماجی شعبے کے کاروباری اداروں کے لئے اقدامات کی تشکیل میں اس تعریف کی ضرورت پڑے گی۔ مزید برآں، سوشل انٹرپرائزز کی واضح شناخت سے افزائش کی صوبائی حکومت عملیوں کی راہ ہموار ہوگی جن کے تحت اس طرح کے پروگراموں پر کام کیا جائے گا جو سوشل انٹرپرائزز کے شعبے کی ترقی کے لئے سازگار ماحول پیدا کریں گے۔

تیسرا، ملک میں ایک ایسے ٹیکس نظام کی ضرورت ہوگی جو سماجی اثرات کو اہمیت دے اور (سوشل) انٹرپرینیورشپ کی طرف آنے میں نوجوان ذہنوں کی حوصلہ افزائی کرے۔ دنیا بھر میں متعدد ایسی مثالیں موجود ہیں جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ٹیکس نظام نے کس طرح ان سرگرمیوں کو

---

1 ورلڈ اکنامک فورم (2017)۔ The Global Gender Gap Report 2017۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://www3.weforum.org/docs/WEF_GGGR_2017.pdf

2 حکومت پاکستان، فنانس ڈویژن (2017) ''پاکستان اکنامک سروے 17-2016''۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://www.finance.gov.pk/survey/chapters_17/Pakistan_ES_2016_17_pdf.pdf

3 ایضاً

4 برٹش کونسل (2017)۔ Activist to Entrepreneur۔ جو یو این ای ایس سی اے پی، ایس ڈی پی آئی اور سوشل امپیکٹ کنسلٹنگ کے اشتراک سے تحریر کی گئی اور یہاں سے دستیاب ہے: https://www.sdpi.org/publications/files/Activist%20to%20Entrepreneur-22%20Dec%202017.pdf

5 برٹش کونسل، The State of Social Enterprise in Bangladesh, Ghana, India and Pakistan۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: https://www.britishcouncil.org/sites/default/files/bc-report-ch5-pakistan-digital_0.pdf

6 صنف سے متعلق رکاوٹوں پر ایس ڈی پی آئی کے معاشی ایجنڈا 2018 کے مسودہ (صفحہ 15) میں بحث کی گئی ہے جو یہاں سے دستیاب ہے: https://www.sdpi.org/research_programme/uploads/Draft%20Economic%20Agenda%202018.pdf

بالکل سادہ بنا دیا۔ جدت آمیز ٹیکس نظام کی بدولت یہ شعبہ معاشرے کے لئے اپنی بعض خدمات کے عوض بعض ٹیکوں پر چھوٹ حاصل کر سکتا ہے۔ ٹیکس واجبات میں اس کمی کا حساب مختلف طریقوں سے لگایا جاتا ہے مثلاً سوشل انٹرپرائز سے مقامی سطح پر کتنے لوگوں کو روزگار ملا، کتنے افراد کو تعلیم اور صحت کی سہولیات میسر ہوئیں، وغیرہ۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اٹھارہویں آئینی ترمیم کے بعد صوبائی حکومتوں نے اپنی ٹیکس اتھارٹیز بھی قائم کر لی ہیں۔ لہٰذا اب سوشل انٹرپرائزز کی مشکلات مزید بڑھ گئی ہیں کہ انہیں صرف ایف بی آر سے متعلق ٹیکس واجبات کا ہی نہیں بلکہ صوبائی ریونیو اتھارٹیز کا بھی خیال رکھنا ہے جن کی تعداد ہر صوبے میں مختلف یعنی تین سے پانچ تک ہے۔ ایک سے زیادہ ٹیکس اتھارٹیز کے قیام کا نتیجہ متعدد اشیاء اور خدمات کے معاملے میں دہرے ٹیکسوں کی صورت میں سامنے آرہا ہے اور اس سے صحیح معنوں میں کام کرنے والی سوشل انٹرپرائزز کے لئے پاسداری کے اخراجات میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔[7]

چوتھا، سوشل سیفٹی نیٹ کے ذمہ دار اداروں اور سماجی تحفظ کے پروگراموں میں 'انخلاء کی حکمت عملیوں' اور پائیداری کے پہلوؤں کے معاملے میں سوشل انٹرپرائزز کے شعبے سے مستفید ہونے والے افراد کی درجہ بندی سے مدد مل سکتی ہے۔ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام یا رورل سپورٹ کی صوبائی تنظیموں جیسے ادارے سمال اینڈ میڈیم انٹرپرائز ڈویلپمنٹ اتھارٹی اور کامرس اینڈ انڈسٹریز کے خواتین چیمبرز جیسے اداروں کے ساتھ مل کر رابطہ و رسائی کو وسعت دے سکتے ہیں اور مستفید ہونے والے افراد کی استعداد بہتر بنانے میں مدد دے سکتے ہیں جو اس کی بدولت مائیکرو اور چھوٹے پیمانے کے سوشل انٹرپرینیورز بن سکتے ہیں۔

پانچواں، خواتین کی زیر قیادت سوشل انٹرپرائزز کی اشیاء اور خدمات کی حوصلہ افزائی وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی سطح پر پبلک پروکیورمنٹ قواعد کے ذریعے بھی کی جا سکتی ہے۔[8] پبلک پروکیورمنٹ ریگولیٹری اتھارٹی کی زیر نگرانی قواعد کی موزوں ترامیم کے ذریعے سرکاری شعبے کی طرف سے ان انٹرپرائزز سے ترجیحی خریداری کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے۔ اس سے نئی قائم ہونے والی انٹرپرائزز کی کایا پلٹ سکتی ہے جو اس یقین کے ساتھ کام کریں گے کہ انہیں طویل مدتی خریدار مل جائیں گے اور ان کی آمدنی کا سلسلہ چلتا رہے گا۔

چھٹا، خواتین کی زیر قیادت متعدد سوشل انٹرپرائزز میں خاطر خواہ تجارتی استعداد موجود ہے۔ ٹریڈ ڈویلپمنٹ اتھارٹی آف پاکستان (ٹی ڈی اے پی) کے ذریعے سوشل انٹرپرائزز کی تیار شدہ اشیاء اور خدمات کی برآمدات میں مدد دی جا سکتی ہے۔ صوبائی حکومتوں کے صنعتی محکموں کے اشتراک سے ٹی ڈی اے پی اندرون و بیرون ملک نمائشوں میں مارکیٹنگ اور نمایاں موجودگی میں معاونت کے ذریعے ان سوشل انٹرپرائزز کو علاقائی اور عالمی تجارتی سرگرمیوں کا حصہ بننے میں مدد دے سکتی ہے۔ آئندہ 'سٹریٹجی ٹریڈ پالیسی فریم ورک' کے سلسلے میں 'خدمات کی تجارت' کو فروغ برآمدات کے اہم ترین ذریعہ کے طور پر زیر غور لایا جائے۔ دوست ممالک کے ساتھ آئندہ آزادانہ تجارت کے سمجھوتوں پر جو بھی مذاکرات ہوں ان میں خدمات کی تجارت کو فروغ دیا جائے۔[9]

وزارت کامرس کو بھی چاہئے کہ وہ سوشل انٹرپرائزز کو درپیش ٹیرف سے ہٹ کر صنف سے متعلق رکاوٹوں کے تجزیہ کے لئے قومی ورکنگ گروپ بنا کر اس کا اجلاس منعقد کرے۔ اس طرح کی رکاوٹوں میں ان سرحدی علاقوں میں جہاں تجارت زمینی راستوں سے ہوتی ہے، خواتین کے لئے ضروری سہولیات کی کمی بھی شامل ہے۔ اسی طرح مائیکرو اور چھوٹے پیمانے پر کام کرنے والی خواتین انٹرپرینیورز کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ ذاتی طور پر ٹیکس محکموں میں جا کر بین الاقوامی تجارت پر کام کرنے والے افسران سے مل سکیں۔ لہٰذا تجویز کیا جاتا ہے کہ ٹیکس، تجارت، محنت اور ماحولیات سمیت تمام قواعد کی پاسداری سے متعلق تمام تر کارروائی آن لائن یا فون کے ذریعے کرنے کی اجازت دے دی جائے۔

دیہی علاقوں میں بالخصوص زرعی شعبے میں کام کرنے والی ان انٹرپرائزز کو زراعت کے پسلائی اور ویلیو چین میں ضم کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بحیثیت مجموعی ویلیو ایڈیشن میں اضافہ ہو گا۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے وزارت نیشنل فوڈ سیکورٹی اینڈ ریسرچ، ٹی ڈی اے پی اور صوبائی حکومتوں کے محکمہ ہائے زراعت کے ساتھ مل کر ایسی معاون خدمات وضع کرے جو دیہی زرعی (سوشل) انٹرپرائزز کی ضروریات کے مطابق ہوں۔ اس میں مارکیٹ کے بارے میں معلومات کے نظام، شہری مارکیٹوں تک رسائی، خام مال اور پیداوار کی قیمتوں کی یقینی حیثیت وغیرہ شامل ہو سکتی ہیں۔

ساتواں، مرکزی بینک نے جہاں نئی ایس ایم ای پالیسی متعارف کرا دی ہے وہیں ایک تفصیلی تجزیہ تیار کرنے کی ضرورت ابھی بھی باقی ہے جس سے وضاحت ہو سکے کہ رسمی ذرائع سے فنڈز مائیکرو اور چھوٹے پیمانے کے سوشل انٹرپرائزز تک کیوں نہیں پہنچ پا رہے۔ بینک خواتین کی زیر قیادت چھوٹے پیمانے کے کاروباری اداروں پر خطرہ مول لینے میں دلچسپی لیتے نظر نہیں آتے جس کا اندازہ ایس ڈی پی آئی کے حالیہ سروے سے حاصل ہونے والی معلومات سے لگایا جا سکتا ہے۔ مائیکرو اور چھوٹے کاروباری اداروں کے لئے فنڈز سے متعلق مالیاتی فریم ورکس اور قواعد میں بھی مناسب ترمیم کی ضرورت پڑے گی تاکہ قرض دینے والے ان باضابطہ اداروں کو مراعات دی جا سکیں جو سوشل انٹرپرائزز کے معاملے میں خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔

سوشل انٹرپرائزز کو قرضہ دینے کے طریقوں کو بھی ان کی ضروریات کے مطابق ڈھالنا اتنا ہی اہم ہے مثلاً درخواست دینے کا طریقہ حتی الوسع حد تک سادہ اور واپسی کے طریقے قدرے لچکدار ہوں۔ اس میں حکومت کی طرف سے کلی یا جزوی ضمانت کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جس سے ان مائیکرو اور چھوٹے کاروباری اداروں اور افراد کو مدد ملے گی جن کی کاروباری بنیاد مضبوط ہو لیکن وہ ضمانت کی شرائط پوری کرنے کی استعداد نہ رکھتے ہوں۔ بینک عملہ کی روایتی تربیت میں صنفی تقاضوں سے ہم آہنگ قرض سرگرمیوں کی تربیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے مرکزی بینک تمام شیڈولڈ بینکوں کے عملہ کے تمام ارکان کے لئے اس نوعیت کی تربیت لازمی قرار دے سکتا ہے۔

آخری بات، صوبائی حکومتوں کو چاہئے کہ وہ کامرس اینڈ انڈسٹری کے خواتین چیمبرز کو ایسے تربیتی مراکز اور آن لائن تربیتی سہولیات فراہم کرنے میں مدد دیں جو خواہشمند خواتین (سوشل) انٹرپرینیورز کے لئے سہ ماہی تربیتی پروگرام چلا سکیں۔ آن لائن تربیت کا راستہ موجود ہو تو نہ صرف گھر بیٹھی خواتین بلکہ ان خواتین کو بھی تربیت حاصل کرنے میں بھرپور مدد مل سکتی ہے جو تعلیم یا کسی دوسرے شعبے میں تربیت حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ مقامی سطح پر تشدد یا تنازعہ کا شکار علاقوں کی خواتین کے لئے بھی یہ طریقہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔[10] اس صورت میں سرکاری اور نجی شعبے کی پارٹنرشپس تربیتی خدمات سب تک پہنچانے میں مدد دے سکتی ہیں۔ ضلعی انتظامیہ اور ترقیاتی پارٹنرز مقامی نجی شعبے کو ان خدمات کی فراہمی میں مدد دے سکتے ہیں۔

---

7 مثال کے طور پر دیکھیں: جمالی، ایس اور وی احمد (2016)۔ Tax Reforms in Sindh. Policy Brief #54۔ سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ پالیسی انسٹی ٹیوٹ۔ دیکھیں ٹیکس اصلاحات پر باب: احمد وی (2017)۔ Pakistan's Agenda for Economic Reforms۔ اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔

8 تفصیلات کے لئے دیکھیں: یاسین، ایف اور وی احمد (2016)۔ Trade Winds of Change - Women Entrepreneurs on the rise in South Asia - Background country study - Pakistan۔ یو این ڈی پی بینکاک۔ جو یہاں سے دستیاب ہے:
http://www.asia-pacific.undp.org/content/dam/rbap/docs/Research%20&%20Publications/poverty/RBAP-IG-2016-TWoC-Pakistan-Country-Study.pdf

9 تفصیلات کے لئے دیکھیں: صفحہ 27: خان، اے و دیگر (2016)۔ The role of youth in Sustainable Development۔ اور سیز ڈویلپمنٹ انسٹی ٹیوٹ۔ جو یہاں سے دستیاب ہے:
http://southernvoice.org/wp-content/uploads/2017/01/sdpi_paper_The-role-of-youth-in-sustainable-development.pdf

10 دیکھیں: خان، ایس اے اور احمد وی 2014۔ Peaceful Economies: Assessing the Role of the Private Sector in Conflict Prevention in Pakistan۔ سٹیبلٹی، انٹرنیشنل جرنل آف سکیورٹی اینڈ ڈویلپمنٹ، 24:3(1)، صفحہ 9-1، ڈی او آئی:
http://dx.doi.org/10.5334/sta.dv

صنف، برداشت اور خواتین کے خلاف تشدد

عنبرین عجائب

ایگزیکٹو ڈائریکٹر
بیداری

پاکستان کم وبیش تین دہائیوں سے خواتین کے خلاف تشدد کے خاتمہ کے لئے برسرپیکار ہے۔ پدرشاہی سوچ پر مبنی گہری اقدار، غربت، قانون کی کمزور حکمرانی اور عدم مساوات پر تشدد انتہا پسندی میں بگاڑ پیدا کرنے والے اہم عوامل ہیں۔ ان تمام عوامل کا خواتین اور لڑکیوں کے استحصال کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ ہیومن ڈویلپمنٹ انڈکس میں پاکستان کا رینک 147 رہا[1] جس میں تعلیمی اور معاشی مواقع کے اعتبار سے شدید صنفی خلاء پائے جاتے ہیں۔ خواتین اور لڑکیوں میں سکول تعلیم کے اوسط سالوں کی تعداد 3.7 ہے جبکہ مردوں اور لڑکوں میں یہ 6.5 ہے۔ خواتین کے معاملے میں انداز اً خام قومی آمدنی 1498 روپے فی کس جبکہ مردوں کے لئے 8376 فی کس رہی۔[2] جہاں تک خواتین کی معاشی ترقی کا تعلق ہے تو ورلڈ اکنامک فورم کے مطابق صنفی خلاء پر اس کے عالمی انڈکس میں پاکستان کا رینک آخری سے پہلے نمبر پر آتا ہے۔[3] انتخابی عمل میں خواتین کی شمولیت کو حالیہ انتخابی اصلاحات میں بظاہر معقول حد تک تسلیم کیا گیا ہے اور ان اصلاحات میں 2014 میں صوبائی اسمبلیوں کی طرف سے منظور کئے گئے مقامی حکومت کے قوانین اور 2017 کے انتخابی قواعد بھی شامل ہیں۔ لیکن فیصلہ سازی میں ان کا کردار آج بھی پست ہے۔[4] یو این ویمن کے مطابق 2013 کے عام انتخابات کے دوران کل امیدواروں میں خواتین کی نمائندگی صرف 2.9 فیصد رہی۔[5]

خواتین اور لڑکیوں کی بااختیار حیثیت براہ راست اس معاشرے سے جڑی ہوتی ہے جہاں قانون کی موثر حکمرانی ہو، جہاں تمام شہریوں کے ساتھ برابر سلوک کیا جاتا ہو اور جہاں تنوع کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ بدقسمتی سے یہ تمام عوامل ہمیں پاکستان میں دیکھنے کو نہیں ملتے اور یوں خواتین کے لئے اپنا موثر کردار ادا کرنے میں شدید رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ مذہبی اقدار کے ساتھ ساتھ پدرشاہی سوچ پر مبنی مضبوط اقدار نے اپنے پنجے پوری طرح گاڑ رکھے ہیں۔ پاکستان میں خواتین کو موثر طور پر بااختیار بنانے میں یہ ایک دیوار کی مانند ہے۔ پنجاب تحفظ خواتین ایکٹ (جس میں گھریلو تشدد کا بے باک انداز میں ازالہ کیا گیا ہے) کے خلاف مذہبی گروہوں کا حالیہ ردعمل اس کی ایک مثال ہے۔ انتہا پسندی اور پدرشاہی ذہنیت کا یہ ملاپ پنجاب اور خیبر پختونخواہ کے حالیہ ضمنی انتخابات سے بھی عیاں ہے جن میں ان مذہبی انتہا پسندوں کو خاطر خواہ ووٹ ملے[6,7]۔ اگرچہ یہ امیدوار انتخابات جیت نہیں پائے لیکن ان مذہبی انتہا پسندوں کی نئی اندراج یافتہ سیاسی جماعت نے جتنی تعداد میں ووٹ حاصل کئے وہ خواتین کو بااختیار بنانے کے لئے سرگرم کرداروں کے نزدیک گہری تشویش کا باعث ہے۔ خواتین کو ووٹ دینے سے روکنے کے واقعات خیبر پختونخواہ[8] اور پنجاب[9,10,11] کے کئی علاقوں میں سامنے آئے جو اس ملاپ کا ایک اور مظہر ہے۔ مذہبی انتہا پسندی اور پدرشاہی ذہنیت کے درمیان اس تعلق کا اظہار زیادہ تر سندھ[12] اور پنجاب میں نوجوان عیسائی اور ہندو لڑکیوں کا مذہب جبراً تبدیل کرانے کے مسئلے کی صورت میں ہوا۔ ایم ایس پی (موومنٹ فار سالیڈیریٹی اینڈ پیس) کی طرف سے جاری کی گئی ایک حالیہ رپورٹ سے سامنے آیا ہے کہ بارہ سے پچیس سال عمر کی ایک ہزار عیسائی اور ہندو لڑکیوں کو ہر سال جبراً اسلام قبول کرایا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق عیسائی لڑکیاں اس تعداد کا 70 فیصد بنتی ہیں جبکہ باقی ہندو لڑکیاں ہیں۔[13] سوال یہ ہے کہ صرف نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کو ہی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیوں کیا جاتا ہے؟ جواب سادہ سا ہے کہ پدرشاہی اقدار شادی کے لئے نوجوان لڑکیوں کے اغواء یا انہیں مجبور کرنے میں مدد دیتی ہیں یا کم از کم اس کی مذمت نہیں کرتیں۔

ملک کے عوامی میدان میں خواتین کے لئے گنجائش دن بہ دن سکڑتی دکھائی دیتی ہے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی شعبوں میں خواتین کے تحفظ اور سلامتی کو یقینی بنانے والے ترقی پسند اور خواتین حامی قوانین رائج ہونے کے باوجود ان قوانین پر عملدرآمد ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔ عملدرآمد میں کمی کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انتظامیہ یا ایگزیکٹو کی آمادگی اس پر برائے نام یا بالکل نہیں ہے جس میں زیادہ تر مردوں کا غلبہ ہے جبکہ دوسرا سبب مضبوط قدامت پسندانہ سماجی اقدار ہو سکتی ہیں۔

ملک کی سماجی بناوٹ خواتین اور لڑکیوں کے معاملے میں روز بروز قدامت پسندانہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ وہ شعبے ہیں جہاں خواتین کو اپنی رائے دینے کی اجازت نہیں ہے۔ انسانی حقوق کمیشن، پاکستان کے مطابق ہر سال پاکستان میں ہزاروں خواتین کو غیرت کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے اور ہر دو گھنٹے میں ریپ کا ایک واقعہ ہوتا ہے۔ ریپ کے مقدمات میں سزا کا تناسب انتہائی پست ہے۔[14]

---

1 پاکستان ٹوڈے (2017)۔ Pakistan ranked 147 on the Human Development Index۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: https://www.pakistantoday.com.pk/2017/03/23/pakistan-ranked-147th-on-human-development-index-un-report/

2 اقوام متحدہ ترقیاتی ادارہ (2016)۔ "ہیومن ڈویلپمنٹ رپورٹ 2016"۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://hdr.undp.org/sites/default/files/2016_human_development_report.pdf

3 ورلڈ اکنامک فورم (2017)۔ "گلوبل جنڈر گیپ رپورٹ 2017"۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://www3.weforum.org/docs/WEF_GGGR_2017.pdf

4 قومی اسمبلی پاکستان، الیکشن ایکٹ 2017۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://www.na.gov.pk/uploads/documents/1506961151_781.pdf

5 این ڈی آئی اور اے این ایف آر ایل (2013)۔ The 2013 National and Provincial Elections in Pakistan۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: https://www.ndi.org/sites/default/files/NDI-ANFREL-Pakistan-EOM-Final-Report.pdf

6 فافن (2017)۔ FAFEN to observe Chakwal By-Election with 48 Trained Citizen Observers۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://fafen.org/fafen-to-observe-chakwal-by-election-with-48-trained-citizen-observers/

7 الیکشن کمیشن ویب سائٹ۔ چکوال پی پی 20 اور این اے 120 کے ضمنی انتخابات کے انتخابی نتائج۔

8 یو الیکٹ (2012)۔ Female Voter Turnout and Women Voting in Pakistan۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://uelect.org.pk/blog/female-voter-turnout-and-women-voting-in-pakistan/

9 ضیاء الرحمان۔ Women barred from elections in Pakistan۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: https://ziaurrehman.net/tag/women-barred-from-elections-in-pakistan/

10 روزٹی وی (2015)۔ Punjab LB Polls: Women reportedly barred from voting in Khushab۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: https://rozetv.com/punjab-lb-polls-women-reportedly-barred-voting-khushab/

11 سپرا نوٹ 6۔

12 ہندوز آف سندھ (2012)۔ Ethnic Cleansing of Hindus of Sindh۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: https://hindusofsindh.wordpress.com/tag/ethnic-cleansing-of-hindus-of-sindh/

13 کرسچین ٹوڈے (2014)۔ Girls are being forced to convert to Islam in Pakistan, but because they are Christian nobody cares۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: https://www.christiantoday.com/article/girls-are-being-forced-to-convert-to-islam-in-pakistan-but-because-they-are-christian-nobody-cares/36776.htm

14. نیشنل کمیشن آن دی سٹیٹس آف ویمن۔ "Assessment of Women Protection Act"۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://www.ncsw.gov.pk/publicationslist#ResReport

معیشت میں بھی خواتین کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔ خواتین کے خلاف تشدد معیشت کے ویلیو چین میں ان کی افادیت اور موثر حیثیت پر اپنا اثر دکھاتا ہے۔ برازیل میں تیار کی گئی ایک مطالعاتی تحقیق [15] کے مطابق خواتین تشدد کی وجہ سے اپنے کام کرنے کے 25 فیصد دن گنوا بیٹھتی ہیں جس سے ان کے مالی ثمرات میں 3 سے 20 فیصد تک کمی آجاتی ہے۔ تشدد کا شکار ہونے والی ماؤں کے بچوں میں بیمار ہونے کا خدشہ تین گنا زیادہ ہوتا ہے اور ان میں سے 63 فیصد بچے سکول کا کم از کم ایک سال دہراتے ہیں یا تعلیم چھوڑ جاتے ہیں۔ [16]

مزید برآں، خواتین کے خلاف تشدد عسکریت پسندی اور انتہا پسندی میں اضافے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ تشدد کا شکار ہونے والی خواتین کے بچے بالخصوص لڑکے اپنے اہل خانہ سے نفسیاتی طور پر کٹ کر رہ جاتے ہیں اور عسکریت پسندوں کے لئے انہیں ہدف بنانا اور پرتشدد انتہا پسندانہ سرگرمیوں میں ساتھ ملانا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ بات پاکستان میں خودکش حملوں سے عیاں ہو جاتی ہے جہاں زیادہ تر حملہ آور اٹھارہ سال کے لگ بھگ عمر کے نوجوان دکھائی دیتے ہیں جن کا تعلق غریب اور محروم خاندانوں سے ہوتا ہے۔

پاکستان میں پرتشدد انتہا پسندی پر جوابی اقدامات بڑی حد تک انسداد دہشت گردی آپریشنز کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ 2001 سے اب تک آرمی ملک بھر میں اس طرح کے بارہ آپریشن کر چکی ہے۔[17] کروڑوں روپے خرچ کئے گئے اور خواتین اور بچوں سمیت ہزاروں افراد کو اندرون ملک نقل مکانی کرنا پڑی۔ انسداد دہشت گردی کے ان اقدامات سے جزوی کامیابی تو حاصل ہوئی ہے لیکن انہیں تقویت دینے کے لئے روک تھام کے اقدامات بھی ضروری ہیں مثلاً غریب نوجوانوں کو معاشی مواقع فراہم کئے جائیں، بچوں کو پرائمری جماعتوں کی ابتدائی سطح سے ہی تربیت دی جائے کہ تنوع ایک لائق تحسین بات ہے، اور مدرسہ اصلاحات لائی جائیں کیونکہ یہ وہ تمام ترکیبیں ہیں جنہیں ابھی تک بروئے کار نہیں لایا گیا۔ برداشت پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کے لئے پرتشدد انتہا پسندی کا 'انسداد' ہی کافی نہیں۔ دور رس بنیاد پر روک تھام کے ایسے مضبوط نظام وضع کرنا ہوں گے جو اس لعنت کو جڑ سے ہی نشانہ بنائیں۔ اس کے لئے فرق اور اختلاف کے معاملے میں برداشت، تائید اور تحسین کے کلچر کو فروغ دینے پر زور دینا ہوگا۔ میڈیا اس حوالے سے ایک اہم آلہ ہے جسے اگر سمجھداری سے استعمال کیا جائے تو تبدیلی کے عمل میں تیزی لا سکتا ہے۔

اسی طرح اگر خواتین کو ساتھ نہ ملایا گیا تو پرتشدد انتہا پسندی کی روک تھام کی کوششیں کارگر نہیں ہو پائیں گی۔ خواتین ملک کی آبادی کا 48 فیصد ہیں۔ ان کے اندر بے پناہ استعداد موجود ہے کہ وہ برداشت پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں۔ پرتشدد تنازعہ کے بارے میں جلد متنبہ کرنے والی علامات وضع کرنے کی کوششوں میں بھی خواتین مثبت کردار ادا کر سکتی ہیں کیونکہ وہ یہ کام اپنے گھر سے کر سکتی ہیں جس کی روشنی میں مقامی سطح پر ہی تدارک اور پرتشدد انتہا پسندی کی روک تھام کی کوششیں کی جا سکتی ہیں۔ تاہم انہیں با اختیار بنانے اور زندگی کے تمام شعبوں میں ان کی شمولیت کے لئے موثر اقدامات کی ایک بھرپور کاوش وقت کا تقاضا ہے۔

اگرچہ پاکستان میں خواتین کو پیہم امتیاز کا نشانہ بنایا جاتا ہے، انہیں عوامی شعبے میں حصہ لینے سے الگ تھلگ رکھا جاتا ہے اور دبایا جاتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ بھی اپنے حقوق اور معاشرے کی سماجی و معاشی بناوٹ میں بہتر شمولیت کی وکالت اور مطالبہ سے پیچھے نہیں ہٹیں۔ خواتین کے لئے انسانی حقوق کے کارکنوں نے خواتین اور لڑکیوں کے خلاف تشدد سے متعلق امور کے ازالہ کے لئے الائنس اور نیٹ ورک بھی تشکیل دیئے ہیں۔ خواتین اور لڑکیوں کے خلاف تشدد کے خاتمہ کا الائنس (ای وی اے ڈبلیو جی)، ہزارہ ویمن نیٹ ورک اور ممکن الائنس ایسی چند مثالیں ہیں۔ یہ نیٹ ورک اور الائنس امن عمل، انتخابی عمل اور فیصلہ سازی میں خواتین کی شمولیت پر موثر پالیسیوں اور بجٹ تخصیص کے لئے حکومت کے ساتھ ایڈووکیسی اور لابی سرگرمیوں کے ذریعے خواتین اور لڑکیوں کے خلاف تشدد کے ازالہ پر کام کر رہے ہیں۔

پرتشدد انتہا پسندی کی روک تھام اور خواتین کی با اختیار حیثیت یقینی بنانے کے دیگر لوازمات میں بھرپور اور متنوع سول سوسائٹی، تمام امور کا احاطہ کرنے والی خواتین کی تنظیمیں، خواتین کے انسانی حقوق کے دفاعی کارکن اور خواتین رہنما شامل ہیں۔ ریاست کو خواتین کی سول سوسائٹی رہنماؤں کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنا چاہئے جس کے لئے قانون کی حکمرانی، برابری اور انسانی حقوق پر مبنی قانون سازی اور غیر امتیازی نظام انصاف کو یقینی بنایا جائے۔ مزید برآں، موجودہ اور نئی آنے والی دونوں سیاسی جماعتوں کی 'صنفی نقطہ نظر' سے جانچ پڑتال ناگزیر ہے۔ اندراج کراتے وقت ان جماعتوں کے ایجنڈا میں خواتین کی با اختیار حیثیت اور برابری ایک ترجیح کے طور پر شامل ہونی چاہئے۔ پرتشدد انتہا پسندی کے خاتمہ کے لئے نیشنل ایکشن پلان پر عملدرآمد میں بھی خواتین کی شمولیت ناگزیر ہے۔ پرتشدد انتہا پسندی اور پالیسی سازی و عملدرآمد میں خواتین کی شمولیت پر بحث پارلیمانی اجلاسوں میں جاری رہنی چاہئے۔ پرتشدد انتہا پسندی سے متعلق پارلیمانی کمیٹیوں میں خواتین کو بطور سربراہ اور ارکان لازماً شامل کیا جائے تاکہ ان کی شمولیت کو صحیح معنوں میں یقینی بنایا جا سکے۔ آخری بات، ذاتی نظریات کے پرچار کے لئے مذہب کا غلط استعمال کرنے والی تنظیموں کی کڑی نگرانی بھی انتہائی ضروری ہے اور یہ کام ایگزیکٹو کے ساتھ ساتھ پارلیمان کے ذریعے بھی ہونا چاہئے۔

---

15 Subordination of gender: reflecting on the vulnerability to domestic violence against women ۔لارا کرسٹینا پیوسیاڈلو، روز اماریا گوڈائے سرپا دافونیسکا اور رفائلہ جیسنر، فیڈرل یونیورسٹی آف پرانا، کیوریتیبا، پی آر، برازیل۔ یونیورسٹی آف ساؤ پاؤلو۔ ساؤ پاؤلو-ایس پی، برازیل۔

16 ایضاً

17 ڈویلپمنٹ ایڈووکیٹ پاکستان، جلد 3، شمارہ 1 (2016)۔ ''پرتشدد انتہا پسندی کی روک تھام''۔ جو یہاں سے دستیاب ہے: http://www.pk.undp.org/content/pakistan/en/home/library/hiv_aids/dap-preventing-violent-extremism.html

انٹرویو

رابعہ جویری آغا

سیکرٹری

وزارت انسانی حقوق

خواتین کے لئے مواقع، انتخاب اور استعداد کے اعتبار سے خاطر خواہ بہتری کے باوجود خواتین کے صنفی ترقی انڈکس (جی ڈی آئی) پر پاکستان کا شمار آج بھی دنیا میں سب سے پیچھے رہ جانے والے ملکوں میں ہوتا ہے۔ اس پر قابو پانے کے لئے کن ڈھانچہ جاتی تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟

سب سے پہلے ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ صنفی انڈکس پاکستان میں کام کرنے والی خواتین کے مکمل کردار کو شمار میں نہیں لاتا۔ جہاں تک غیر رسمی شعبے کے کارکنوں کی تعداد کا تعلق ہے تو مثال کے طور پر گھر بیٹھ کر کام کرنے والی خواتین، زراعت میں کام کرنے والی خواتین وغیرہ کا دستاویزی ریکارڈ ہی مرتب نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا پہلا کام تو یہ کیا جائے کہ غیر رسمی شعبے کے ان کارکنوں کا دستاویزی ریکارڈ تیار کیا جائے اور انہیں شمار میں لایا جائے۔ یہ کام ہو جائے تو رینکنگ خود بخود اوپر چلی جائے گی۔

اس پر تو بحث ہی نہیں ہے کہ پاکستان کی خواتین اپنی معاشی اور سماجی استعداد کو بروئے کار نہیں لا رہیں۔ تاہم ہمیں خواتین کو بے اختیار کرنے والے عوامل کو سمجھنے کے لئے اس طرح کے انڈکس کو کم اور داخلی حالات کو زیادہ دیکھنے کی ضرورت ہے۔

خواتین کو بااختیار بنانے کا جائزہ لیتے ہوئے دو بڑے عوامل کو زیر غور لانا ضروری ہے۔ ایک، خواتین پر ہونے والی سرمایہ کاری اور دوسرا، ادارہ جاتی اور سماجی ڈھانچے جو اس سرمائے کی معاونت کرتے ہیں۔ سرمائے کے اعتبار سے ہمیں خواتین پر ہونے والی سماجی سرمایہ کاری کا جائزہ لینا ہوگا کہ انہیں کس قدر تعلیم فراہم کی جا رہی ہے۔ پھر مالی سرمائے کی بات آجاتی ہے کہ مثلاً بینک اکاؤنٹ یا مائیکرو فنانس تک رسائی جو زرعی ترقیاتی بینک کی بدولت 54 فیصد تک پہنچ چکی ہے۔ پھر وہ سماجی ڈھانچے اور نیٹ ورک آجاتے ہیں جو بحیثیت مجموعی کمیونٹی میں خواتین کو معاونت فراہم کرتے ہیں اور انہیں بااختیار بنانے کے لئے بھی اہم بنیادوں کا کام دیتے ہیں۔ آخر میں مادی سرمایہ یعنی اراضی اور املاک بھی اس تمام تر سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ حکومت ان تمام اقسام کے سرمایہ کی فراہمی کے لئے بھرپور طریقے سے کام کر رہی ہے تاہم تبدیلی راتوں رات نہیں آسکتی۔ لیکن اگر ان سب شعبوں میں ضروری مواد ڈال دیا جائے اور خواتین کو مالی شمولیت کے مرکزی دھارے کا حصہ بنا دیا جائے، جو مثال کے طور پر بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام جیسی سکیموں کی بدولت آہستہ آہستہ ہو رہا ہے، تو پھر تبدیلی جلد دیکھنے کو مل جائے گی۔ صحت اور تعلیم کے شعبوں میں خواتین کے لئے بجٹ اخراجات میں اضافہ بھی خواتین کو ترقیاتی بحث کے مرکزی دھارے میں لانے کے لئے اہم ہے۔ یہ وہ ضروری مواد ہے جو خواتین کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنانے کے لئے درکار ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس ضروری مواد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے معاون نظاموں کی ضرورت ہے۔ یہ معاون نظام ستون کا کردار ادا کرتے ہیں جن میں ثقافت، اقدار اور ادارے شامل ہیں۔

مکرر ارشاد

”... پاکستان میں ایک بہت بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ اس بات کا احساس پیدا ہو رہا ہے کہ حقوق بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔“

حکومت ایسے قوانین نافذ کر رہی ہے جن کے تحت خواتین کے ساتھ کسی بھی طرح کی بدسلوکی مانع ہو جائے گی مثلاً صنفی تشدد، صنف کی بنیاد پر ہراساں کرنے کے خلاف قوانین وغیرہ اور تمام صوبے اس حوالے سے کافی فعال دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے قوانین بھی وضع کئے جا رہے ہیں جو خواتین کو قرضوں تک رسائی، کوٹہ پالیسیوں، منصفانہ نمائندگی وغیرہ کے اعتبار سے بااختیار بناتے ہیں۔

ثقافت اور اقدار کے حوالے سے دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ آہستہ آہستہ اپنی بچیوں کو حصول تعلیم کے لئے بھیجنے یا انہیں غیر روایتی کیریئر اپنانے کی اجازت دینے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان میں وہ خاندان خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو زیادہ ترقی پسند ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت صرف سول سروس میں نئے بھرتی ہونے والے افراد میں خواتین کا تناسب 55-50 فیصد ہے۔ لہٰذا وقت کے ساتھ رویئے ارتقاء پذیر ہیں۔ اس بناء پر خواتین کی بہتری کے لئے اقدار، معاشرے اور ثقافت کی مثبت معاونت بھی اتنی ہی اہم ہے۔

آپ کی رائے میں کیا موجودہ پالیسیاں اور قومی فریم ورک خواتین کو خاطر خواہ حد تک بااختیار بنانے کا کام دیتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ان پالیسیوں پر عملدرآمد میں کون سی رکاوٹیں درپیش ہیں اور اگر نہیں تو کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

جی ہاں، اس سے خاطر خواہ حد تک نمٹ لیا گیا ہے۔ ماضی میں ہر وہ چیز جو انسانی حقوق یا عورتوں کے حقوق سے متعلق ہوتی تھی، وہ رعایت سمجھی جاتی تھی۔ پاکستان میں ایک بہت بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ اس بات کا احساس کیا جا رہا ہے کہ حقوق بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔ اس بارے میں آگاہی بڑھ رہی ہے کہ جب کوئی غیر محفوظ خاتون کچھ مانگے تو وہ کوئی رعایت نہیں مانگ رہی بلکہ اصل میں وہ اپنا بنیادی حق مانگ رہی ہے۔ حقوق کی بات اب ہونے لگی ہے۔ پاکستان میں اب یہ چیز زور پکڑ رہی ہے اور پالیسیوں کی شکل اختیار کر رہی ہے۔

اس میں سول سوسائٹی اور میڈیا نے خاصا مثبت کردار ادا کیا ہے۔ انہی قوتوں کے پیدا کئے ہوئے دباؤ کا اثر ہے کہ بڑے متعلقہ فریق اصل اسباب کو دور کرنے کے لئے نچلی سطح پر جا رہے ہیں۔

قانون سازی کے اعتبار سے لاتعداد قوانین اور ایکٹ منظور ہو چکے ہیں۔ انسانی حقوق پر ایک پوری وزارت بنا دی گئی ہے۔ پاکستان خواتین پر متعدد کنونشنز کی توثیق کر چکا ہے۔ مزید برآں، سپریم کورٹ آف پاکستان میں ایک انسانی حقوق سیل بنا دیا گیا ہے۔ نیشنل ایکشن پلان میں بھی خواتین کو بااختیار بنانے کے تقاضے پورے کئے گئے ہیں۔ حال ہی میں اٹارنی جنرل آف پاکستان کی سربراہی میں اسلام آباد میں ایک فیڈرل ٹریٹی امپلی منٹیشن سیل بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کے سیل ان وعدوں پر ہونے والی کارروائی کو آگے بڑھاتے ہیں جو ہمارا ملک بین الاقوامی سطح پر کر چکا ہے۔ لہٰذا، قوانین اور عملدرآمد کے ادارے موجود ہیں اور اپنا کردار فعال طریقے سے ادا کر رہے ہیں۔

بہرحال چیلنج بھی موجود ہیں۔ پہلا چیلنج آگاہی کا ہے۔ بھلے کچھ لوگ قانون کے بارے میں جانتے ہیں لیکن ہر شخص اس بات سے آگاہ نہیں ہے کہ قانون تک رسائی کس طرح ملے گی۔

قانون تک رسائی، دستیاب ذرائع تک رسائی، اداروں تک رسائی اور دستیاب ذرائع اور اداروں کے بہترین استعمال کے بارے میں آگاہی وہ رخ ہیں جن پر ہر شخص میں شعور و آگاہی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ میڈیا، سول سوسائٹی اور خواتین ارکان پارلیمنٹ، سب کو آگاہی پیدا کرنے اور رسائی فراہم کرنے میں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔

دوسرا چیلنج عدم برداشت اور اتحاد کی کمی ہے۔ ہمارا ایک سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم الگ الگ ٹکڑوں میں کام کرتے ہیں۔ اصل ضرورت ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی ہے۔ اگر ہم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مل کر کام کرنا ہوگا کیونکہ یہ جنگ تنہا نہیں لڑی جاسکتی۔ اور مل کر کام کرنا تبھی ممکن ہوگا جب ہمارے اندر برداشت ہوگی۔

تیسرا چیلنج، محدود مالی وسائل کا ہے۔ اس زور کو آگے بڑھانے کے لئے تمام ترقومی پالیسی اور منصوبہ سازی میں خاطر خواہ مالی وسائل اور خاطر خواہ بجٹ مختص کرنا انتہائی ناگزیر ہے۔

آخری چیلنج، دانشورانہ اور انسانی استعداد کی کمی کا ہے۔ ایک بڑا سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے ہاں اس قدر استعداد موجود ہے جو صنفی مسئلے کو دور کرنے میں اپنا کردار ادا کرسکتی ہو۔

قانون ساز اداروں (پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں) میں جہاں خواتین کی نمائندگی خاطر خواہ حد تک بہتر ہوئی ہے وہیں طرز حکمرانی کے دیگر اداروں مثلاً عدلیہ، پولیس اور سول سروس وغیرہ میں وہ آج بھی نمائندگی کی کمی کا شکار ہیں۔ آپ کی رائے میں اس تضاد کا سبب کیا ہے اور اس سلسلے میں کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

مقننہ کے اداروں میں خواتین کی شمولیت میں اضافہ کے علاوہ دیگر عوامی اداروں میں بھی ان کی نمائندگی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ خواتین کی ایک بڑی تعداد آہستہ آہستہ سول سروسز میں داخل ہو رہی ہے۔ تاہم ترقی کی سیڑھی پر اوپر جانے میں انہیں کچھ وقت لگے گا۔ اس کا سبب نشوونما کا عرصہ ہے جو اس معاملے میں تیس سال کے لگ بھگ ہے۔ اگر سپریم کورٹ یا عدلیہ وغیرہ میں خواتین کم ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ پندرہ بیس سال پہلے وہاں کوئی خواتین موجود نہ تھیں۔ اس لئے نشوونما کا عرصہ وہ عامل ہے جس کے باعث ان میں سے بعض شعبوں میں زیادہ خواتین دیکھنے کو نہیں ملتیں۔

پاکستان میں ایک طرف معاشیات، سیاسیات اور قانون اور دوسری جانب ثقافت، پدرشاہی نظام اور مذہب کا آپس کا میل جول ایسی منفرد مشکلات پیدا کر دیتا ہے جن کے ہاتھوں اس راہ پر قدم رکھنا کانٹوں پر چلنے کے مترادف ہو جاتا ہے۔ آپس میں جڑے ان محرکین کو کس طرح پہلو بہ پہلو رکھا جائے کہ خواتین کے ساتھ سلوک کے اعتبار سے ایک یکساں سوچ سامنے آسکے؟

ثقافت اور روایات وہ ستون ہیں جو قوانین وضوابط کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس لئے خواتین کو بااختیار بنانے اور انہیں تحفظ دینے کے قوانین تو موجود ہیں لیکن جب تک روئیے اور ثقافت خواتین کی مدد نہیں کریں گے ان کی اصل استعداد اور قوت کو بروئے کار نہیں لایا جاسکتا۔

پائیدار ترقی کے عالمی مقاصد میں صنفی پہلوؤں کو معیشت کے تمام شعبوں میں ضم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ کی رائے میں اس مقصد کے حصول کے لئے دیگر ملکوں میں کون سے ایسے دیرپا عملی ماڈل ملتے ہیں جنہیں پاکستان میں اپنایا جاسکے؟

پائیدار ترقی کے عالمی مقاصد پر منصوبہ سازی، ترقی و اصلاحات کی وزارت بلاشرکت غیرے کام کر رہی ہے اس لئے یہ انہی کے تحت آتے ہیں۔ تاہم وہ بھی ایک صنفی سیل پہلے ہی قائم کر چکے ہیں اور صنفی حقوق پر بھی فعال طریقے سے کام کر رہے ہیں۔

انٹرویو

جمشید قاضی

کنٹری ریپریزنٹیٹو

یو این ویمن پاکستان

خواتین کے لئے مواقع، انتخاب اور استعداد کے اعتبار سے خاطرخواہ بہتری کے باوجود خواتین کے صنفی ترقی انڈکس (جی ڈی آئی) پر پاکستان کا شمار آج بھی دنیا میں سب سے پیچھے رہ جانے والے ملکوں میں ہوتا ہے۔ اس پر قابو پانے کے لئے کن ڈھانچہ جاتی تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟

تعلیم، صحت اور دیگر اشاریوں کی بنیاد پر انسانی ترقی اور صنفی پہلوؤں کی پیمائش کرنے والے کئی ایسے انڈکس ہیں جن کے حوالے بڑی باقاعدگی کے ساتھ دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً جی ڈی آئی کے علاوہ ورلڈ اکنامک فورم صنفی خلاء کی عالمی رپورٹ یا 'گلوبل جنڈر گیپ رپورٹ' تیار کرتا ہے جس میں پاکستان مسلسل تین سالوں سے صنفی برابری کے اعتبار سے آخری سے پہلے رینک پر آرہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صنفی امتیاز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ڈھانچے، قانون اور اقدار میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے لیکن پہلے ان پہلوؤں کو سمجھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جن پر اس طرح کے بعض انڈکس تیار کئے جاتے ہیں تاکہ ہم بہتر معلومات پر مبنی پالیسی فیصلے کرسکیں۔

میری رائے میں انڈکس پر پاکستان کا رینک اتنا پیچھے نہیں ہونا چاہئے کیونکہ بعض پہلوؤں میں اس کی کارکردگی خاصی اچھی ہے اور دیگر شعبوں میں قومی شماریاتی معلومات معاشرے اور معیشت میں خواتین کے بھرپور کردار کا احاطہ کرنے کے معاملے میں پورا انصاف نہیں کرتیں۔ سیاسی شمولیت پر نظر دوڑائیں جہاں پاکستان کے صنفی اشاریے معقول حد تک اچھے ہیں، تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ گزرے سالوں کے دوران اس اشاریے میں پاکستان نے واقعی بہتری دکھائی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ او ای سی ڈی کے کئی ممالک کے مقابلے میں پارلیمنٹ میں خواتین کا تناسب (21 فیصد) زیادہ ہے۔ وہ مسائل جن میں پاکستان کو واقعی مشکل پیش آرہی ہے ان میں سکول سے باہر لڑکیوں کی زیادہ تعداد اور خواتین کی پست معاشی شمولیت شامل ہیں جو بڑی حد تک پاکستان کی ناقابل رشک رینکنگ کے ذمہ دار ہیں۔ دوسری جانب جب ہم اس ڈیٹا کا موازنہ نیپال جیسے کسی ملک سے کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ 'کم ترقی یافتہ ملک' شمار ہونے کے باوجود صنف کے میدان میں اس کی کارکردگی بہتر ہے۔ اس کے اسباب میں اس طرح کے حقائق شامل ہیں کہ یہاں افرادی قوت میں خواتین کی شمولیت کہیں زیادہ یعنی 80 فیصد ہے، عوامی مقامات پر خواتین کی نقل وحرکت کافی زیادہ ہے اور پدرشاہی نظام نسبتاً زیادہ سخت نہیں ہے۔ اس افرادی قوت میں خواتین کا ایک بڑا حصہ غیر رسمی شعبے میں کام کررہا ہے اور گھر کے ضروری کام انجام دے رہا ہے مثلاً دیہی خواتین پانی اور جلانے کی لکڑی لانے کی ذمہ داریں اور ان حقائق کو باضابطہ طور پر شمار کیا جاتا ہے اور یہ 'کام' کے زمرے میں آتے ہیں۔ اسی طرح اگر پاکستان کے دیہی علاقوں کی خواتین اور گھروں میں بیٹھ کر کام کرنے والے کارکنوں، جن میں زیادہ تر خواتین شامل ہیں، کو بھی افرادی قوت کے اعداد وشمار میں شامل کرلیا جائے تو 25 فیصد کی موجودہ تعداد لائق تحسین حد تک بڑھ جاتی ہے۔ محض مثال کے طور پر سندھ اور پنجاب کو لے لیں، یہ حقیقت ہم سب جانتے ہیں کہ 12 ملین خواتین سلائی، بُنائی، چوڑی سازی اور دستکاری جیسے معاشی کام اپنے گھروں میں بیٹھ کر غیر رسمی انداز میں کررہی ہیں پھر بھی ان کی اکثریت کو افرادی قوت میں شمار نہیں کیا جاتا اور ان کے آجر انہیں پورے حقوق اور تحفظ فراہم نہیں کرتے۔ حوصلہ افزاء خبر یہ ہے کہ سندھ اور پنجاب دونوں نے گھریلو کارکنوں کی پالیسی منظور کرلی ہے جو اس کمی کا ازالہ کرتی ہے لیکن اب اس پر صحیح معنوں میں عملدرآمد بھی ہونا چاہئے۔

طریقہ کار کی بنیاد پر صنف کے عالمی انڈکس اور ان میں پاکستان کی پست رینکنگ پر تفصیلی بحث کے بعد، ہم یہ بھی جاننے ہیں کہ محض ان سے پاکستان میں خواتین اور لڑکیوں کے لئے صنفی محرکین میں سازگار تبدیلی نہیں آئے گی۔ ڈھانچے کی سطح پر نقل وحرکت یا اس کی کمی ان بڑی رکاوٹوں میں سے ایک ہے جو خواتین کو سکول، کالج، مارکیٹ، کام کی جگہ یا حتیٰ کہ تفریحی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے بھی روکتی ہیں جن میں کھیل کی سرگرمیاں یا محض کسی مقامی ڈھابے پر اپنی دوستوں کے ساتھ چائے کی پیالی سے لطف اندوز ہونا بھی شامل ہیں۔ یو این ویمن، پنجاب اور خیبر پختونخواہ کی حکومتوں کے ساتھ مل کر اس رکاوٹ کو دور کرنے اور اس امر کو یقینی بنانے کے لئے کام کررہی ہے کہ خواتین کے لئے پبلک ٹرانسپورٹ کے نئے اور محفوظ مواقع فراہم کئے جائیں۔ عورت فاؤنڈیشن اور محکمہ ترقی خواتین جیسے سول سوسائٹی پارٹنرز کے ساتھ مل کر اور آسٹریلوی حکومت کی مالی مدد سے ہم نے لاہور میں پبلک ٹرانسپورٹ نظام میں خواتین کے تحفظ کا پہلا جائزہ یعنی 'ویمن سیفٹی آڈٹ' تیار کیا۔ کچھ عجب نہیں کہ ہمارے سروے سے سامنے آیا کہ لاہور میں پبلک ٹرانسپورٹ پر سفر کرنے والی تقریباً 90 فیصد خواتین کسی نہ کسی شکل میں صنفی طور پر ہراساں کئے جانے کے واقعات سے گزر چکی ہیں۔ لہٰذا اس جائزے میں ایسی شدید رکاوٹوں کی نشاندہی کی گئی جن کے ہاتھوں کئی عوامی مقامات تک خواتین محفوظ رسائی حاصل نہیں کرپاتیں اور ان کی نقل وحرکت محدود رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جائزے میں ٹھوس سفارشات بھی پیش کی گئی ہیں کہ شہر کو کس طرح خواتین کے لئے زیادہ محفوظ بنایا جاسکتا ہے مثلاً ان میں بس اڈوں پر روشنی کے بہتر انتظامات اور بس ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کے لئے صنفی تقاضوں سے ہم آہنگ تربیت بھی شامل ہیں۔ خیبر پختونخواہ میں ہم محکمہ ٹرانسپورٹ اور یو این او پی ایس جیسے اقوام متحدہ کے پارٹنر اداروں کے ساتھ مل کر حکومت جاپان کی مدد سے مردان اور ایبٹ آباد کے شہروں میں صرف خواتین کے لئے بسیں فراہم کرنے پر کام کررہے ہیں تاکہ خواتین کی نقل وحرکت میں بہتری آئے جس کے نتیجے میں زیادہ خواتین کالج یا یونیورسٹی جائیں گی اور روزگار حاصل کریں گی۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میں جہاں صنف کے لحاظ سے الگ الگ چلنے کا حامی نہیں ہوں وہیں خیبر پختونخواہ کے سیاق وسباق میں صرف خواتین کے لئے مخصوص بسوں کی فراہمی اس نقطہ نظر سے کیا جانے والا عارضی اقدام ہے کہ وقت کے ساتھ یہ باہمی احترام پر مبنی معاشرے کی شکل اختیار کرلے گا جس میں اصناف کے درمیان میل جول کو محض اخلاقیات یا بداخلاقی کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔

نقل وحرکت کے علاوہ کام کرنے کی جگہ پر صنفی برابری بھی نہ صرف خواتین کو بااختیار بنانے کے لئے ناگزیر ہے بلکہ اس سے بھرپور معاشی افزائش کی راہیں بھی کھلیں گی۔ مکینزی گلوبل انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے 2015 میں تیار کی گئی ایک رپورٹ کے مطابق افرادی قوت میں صنفی برابری کا خلاء دور کرنے کا نتیجہ 2025 تک عالمی جی ڈی پی کے لئے مزید 12 ٹریلین امریکی ڈالر کی صورت میں برآمد ہوگا۔ اگرچہ حکومت نے ہر صوبے کو سامنے رکھتے ہوئے سرکاری ملازمت میں 10 سے 20 فیصد تک کے کوٹہ مختص کردیئے ہیں لیکن محض بھرتی کے برعکس خواتین کی بحالی کی حکمت عملیوں پر زیادہ توجہ دینا ضروری ہے۔ پاکستان میں حکومت کے بعض شعبوں اور بالخصوص نجی شعبے دونوں میں زیادہ خواتین کو مائل کرنے اور انہیں برقرار رکھنے کے علاوہ افرادی قوت کو متنوع بنانے کی پالیسیوں اور حکمت عملیوں کے اعتبار سے بہترین مروجہ طریقے موجود ہیں اور ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تجربات اور معلومات کو زیادہ پھیلایا جائے کہ کون سا طریقہ کار آمد رہا اور کون سا نہیں۔ اقوام متحدہ کے لئے یہ ایک تاریخی کامیابی ہے کہ

مکرر ارشاد

"... یہ محض لفظ 'صنف' یا 'خواتین' کو ہر دستاویز کا حصہ بنانے کا نام ہی نہیں بلکہ اس میں پالیسی تشکیل، پراجیکٹ پر عملدرآمد پر صحیح معنوں میں سوچ بچار کی جاتی ہے، آبادی پر اثرانداز ہونے والے کسی اقدام کی نگرانی اور جانچ پرکھ کی جاتی ہے اور اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی ضروریات اور ترجیحات مختلف ہیں اور یوں اس امر کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ خواتین معاشرتی ترقی کے عمل سے باہر نہ رہ جائیں یا انہیں مساوی مواقع سے محروم نہ کیا جائے۔"

ادارے کی اعلیٰ ترین سطح (محکموں اور اقوام متحدہ اداروں کے عالمی سربراہان) پر 50:50 کے تناسب سے برابری پیدا کر دی گئی ہے اور یوں موجودہ سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ کا کیا ہوا وعدہ پورا ہوگیا ہے۔ تاہم پاکستان میں جہاں ہمارے صنفی برابری کے اعداد و شمار سرکاری اور نجی شعبے دونوں کے زیادہ تر اداروں سے بہتر ہیں وہیں ابھی بھی ہمیں صنفی برابری کے حصول اور اس امر کو یقینی بنانے کے لئے ایک طویل سفر طے کرنا ہے کہ ایک بار خواتین بھرتی ہو جائیں تو اس کے بعد کیریئر میں آگے بڑھنے کی ایک باقاعدہ راہ عمل موجود ہو اور ماحول معاون ہو۔

آپ کی رائے میں کیا موجودہ پالیسیاں اور قومی فریم ورک خواتین کو خاطر خواہ حد تک بااختیار بنانے کا کام دیتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ان پالیسیوں پر عملدرآمد میں کون سی رکاوٹیں درپیش ہیں اور اگر نہیں تو کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

پاکستان میں صنفی برابری سے متعلق پالیسیوں اور قوانین کی کوئی کمی نہیں جو آئین کے آرٹیکل 25 سے شروع ہوتے ہیں اور وژن 2025 دستاویز تک ہر جگہ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ وفاقی اور صوبائی سطح پر گھریلو تشدد، کام کرنے کی جگہ پر ہراساں کرنے، تیزاب کے جرائم پر متعدد قوانین اور خواتین کی حیثیت پر کمیشنوں جیسے ادارہ جاتی نظام بھی قائم کر دیئے گئے ہیں۔ خواتین کو بااختیار بنانے کی ایک تازہ ترین اور ترقی پسندانہ پالیسی خیبر پختونخواہ حکومت کی طرف سے منظور کی گئی ہے جس میں سرکاری ملازمت میں خواتین کا کوٹہ 20 فیصد تک بڑھانے اور وزیر اعلیٰ کی سربراہی میں جنڈر سٹیئرنگ کمیٹی کے قیام کا وعدہ کیا گیا ہے۔ عملدرآمد ہو جائے تو اس کی بدولت ایسی شاندار تبدیلی خاصی تیز رفتاری کے ساتھ آئے گی جس سے خواتین سیاست اور ترقی سے متعلق مرکزی فیصلوں پر ہونے والی اصل پالیسی بحثوں کا حصہ بن سکیں گی اور ان کا کردار محض 'خواتین سے متعلق امور' تک محدود نہیں رہے گا۔ صنفی برابری کوئی ایسی چیز نہیں جس پر الگ الگ ٹکڑوں کی شکل میں کام کیا جا سکے۔ تمام شعبوں میں ترقی اور تمام متعلقہ فریقوں کو مل کر اس کے لئے کام کرنا ہوگا کیونکہ فی الواقع ہر گفتگو، پالیسی یا عمل کا ایک صنفی پہلو ہوتا ہے۔

وزارت منصوبہ سازی کی طرف سے تیار کی گئی وژن 2025 دستاویز میں طے کئے گئے اشاریوں میں ایک یہ بھی ہے کہ 2025 تک پاکستان افرادی قوت میں خواتین کی شمولیت کو 25 فیصد کی موجودہ شرح سے بڑھا کر 45 فیصد تک لانا چاہتا ہے۔ اگر ہم سب اس ایک مقصد کے حصول پر بھی کام کرنے لگ جائیں تو محض پائیدار ترقی کے عالمی مقصد نمبر 5 پر پیشرفت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ان میں سے کئی عالمی مقاصد پر عظیم الشان کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ عالمی تجربہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواتین کی مالی آزادی اور بااختیار معاشی حیثیت، کمیونٹی سطح پر تعلیم اور صحت پر بھرپور سرمایہ کاری کے لئے ایک زوردار قوت محرکہ کا کردار ادا کرتی ہے اور یہ بہتر نقل و حرکت، حقوق پر خود آگاہی اور خواتین کو بااختیار بنانے سے روکنے والی ضرر رساں معاشرتی اقدار اور مروجہ طریقوں سے نجات کو بھی عملی شکل دیتی ہے۔

صنف کو مرکزی دھارے میں لانا ایک پیچیدہ اور جان جوکھوں کا کام ہے اور اکثر اسے پوری طرح سمجھا نہیں جاتا۔ یہ محض لفظ 'صنف' یا 'خواتین' کو ہر دستاویز کا حصہ بنانے اور کسی ورکشاپ یا پینل میں موجود خواتین کی تعداد کا شمار کرنے کا نام ہی نہیں بلکہ اس میں پالیسی تشکیل، پراجیکٹ پر عملدرآمد پر صحیح معنوں میں سوچ بچار کی جاتی ہے، آبادی پر اثر انداز ہونے والے کسی اقدام کی نگرانی اور جانچ پرکھ کی جاتی ہے اور اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی ضروریات اور ترجیحات مختلف ہیں اور یوں اس امر کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ خواتین معاشرتی ترقی کے عمل سے باہر نہ رہ جائیں یا انہیں مساوی مواقع سے محروم نہ کیا جائے۔

قانون ساز اداروں (پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں) میں جہاں خواتین کی نمائندگی خاطر خواہ حد تک بہتر ہوئی ہے وہیں طرز حکمرانی کے دیگر اداروں مثلاً عدلیہ، پولیس اور سول سروس وغیرہ میں وہ آج بھی نمائندگی کی کمی کا شکار ہیں۔ آپ کی رائے میں اس تضاد کا سبب کیا ہے اور اس سلسلے میں کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

اس سوال کا کوئی آسان جواب نہیں ہے۔ جزوی طور پر یہ اس سماجی کیفیت کی بات ہے جس میں لڑکیوں کو سکول میں بتایا جاتا ہے کہ بڑے ہو کر انہیں کس طرح کے پیشے اختیار کرنے چاہئیں۔ لہٰذا شروع سے ہی سکول اساتذہ اور معلمین کا کام ہوتا ہے کہ وہ کمسن لڑکیوں اور لڑکوں کے ذہنوں میں امکانات اور ترقی کے نئے دروازے کھولنے میں مدد دیں۔ مردوں اور عورتوں کے صنفی کرداروں کو کم عمری میں ہی تبدیل کرنا بہت ضروری ہے۔ پاکستان میں، میں نے بم ڈسپوزل کی خواتین ماہرین بھی دیکھی ہیں اور مرد نرسیں بھی۔ پیشے کے انتخاب کے اعتبار سے یہ دونوں باتیں شاذ و نادر دیکھنے میں آتی ہیں جو صنف سے متعلق دقیانوسی خیالات کے خلاف جاتی ہیں لیکن ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے کیونکہ یہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ممکنات کی دنیا وسیع کرنے کا نام ہے جس کی بدولت انہیں وہی کام کرنے اور اس میں ترقی کرنے کا موقع ملتا ہے جس میں وہ بہترین ہیں اور یوں وہ پاکستانی معاشرے کے لئے اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

پولیس فورس جیسے بعض شعبوں میں خواتین کی شمولیت میں حائل کچھ رکاوٹیں حیران کن حد تک بڑی بنیادی نوعیت کی ہیں۔ پاکستان بھر میں پولیس فورس میں خواتین کی دو فیصد سے بھی کم نمائندگی کی کئی وجوہات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بعض علاقوں میں انہیں بیت الخلاء کی سہولیات تک رسائی میسر نہیں اور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس کی وجہ سے بعض خواتین افسران کو ملازمت چھوڑنا پڑ جاتی ہے کیونکہ کام کرنے کی جگہ مردوں نے بنیادی طور پر مردوں کے لئے ہی ڈیزائن کی تھی جس میں خواتین کی ضروریات کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ یہاں یہ سبب ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنے فرائض سے خوفزدہ تھیں کیونکہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں تو خواتین اپنے مرد ساتھیوں سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر لگن اور مہارت کے ساتھ ضرور کام کرتی ہیں۔

خواتین کے سینئر عہدوں تک پہنچنے اور کیریئر میں آگے بڑھنے کے حوالے سے مردوں کے رویوں میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ کئی نوجوان مرد اس بات پر برہم نظر آتے ہیں کہ تبدیلی کا ایک آہستہ لیکن خفیف عمل جاری ہے جو ان کے نزدیک ان کی روایتی اور تاریخی مراعات کے لئے خطرہ ہے۔ ہمیں مردانگی کے تصورات کی دریافت نو کرنا ہوگی اور انہیں نئے سرے سے تصور کرنا ہوگا جس میں مردوں کو بھی اجازت ہوگی کہ وہ بھی گھائل ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ خاندان کی کفالت یا رکھوالی کا سارا بوجھ انہی کے کاندھوں پر ہو۔ مردوں اور عورتوں کے روایتی کردار آہستہ آہستہ نئی شکل اختیار کر رہے ہیں اور تبدیلی کے کسی بھی دوسرے عمل کی طرح اس میں اکھاڑ پچھاڑ تو ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ یہ خوفناک بھی ہو۔ صنفی برابری کوئی کرکٹ میچ نہیں کہ جس میں ایک ٹیم کی جیت دوسری ٹیم کی ہار ہوگی۔ خواتین اور لڑکیاں جب سماجی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے آگے بڑھیں گی، پھلیں پھولیں گی تو یہ پوری انسانیت کی اجتماعی فتح ہوگی۔

پاکستان میں ایک طرف معاشیات، سیاسیات اور قانون اور دوسری جانب ثقافت، پدرشاہی نظام اور مذہب کا آپس کا میل جول ایسی منفرد مشکلات پیدا کر دیتا ہے جن کے ہاتھوں اس راہ پر قدم رکھنا کانٹوں پر چلنے کے مترادف ہو جاتا ہے۔ آپس میں جڑے ان محرکین کو کس طرح پہلو بہ پہلو رکھا جائے کہ خواتین کے ساتھ سلوک کے اعتبار سے ایک یکساں سوچ سامنے آسکے؟

قوانین آپ کو پابند بنا دیتے ہیں۔ البتہ مذہب اور ثقافتی اقدار بالخصوص شدید حد تک قدامت پسند اور قبائلی علاقوں میں لوگوں کی زندگیوں پر اپنا بے پناہ اثر دکھاتے ہیں۔ ترکی یا انڈونیشیا جیسے ممالک جو دونوں کے درمیان توازن پیدا کرنے میں کامیاب رہے ہیں، وہاں شاید ایسی اچھی مثالیں ہیں جن سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

رابطے پیدا کرنے کا کام شروع کرنے کے لئے ہمیں کمیونٹی میں ایسے اعتدال پسند، روشن خیال مذہبی حلقوں اور آوازوں کو تلاش کرنا ہوگا جو ثقافت اور مذہب کے ساتھ ساتھ قوانین اور کنونشنز دونوں کو سمجھتے ہوں۔ انہیں ساتھ ملانے کے لئے ہمیں ایسے افراد کی طرف ہاتھ بڑھانا ہوگا جن کا تعلق قدامت پسند گروہوں سے ہو لیکن جو وسیع تر منظر نامے کو بھی سمجھتے ہوں اور ان کے ساتھ ضروری نہیں کہ مذہب پر بلکہ پدرشاہی سوچ پر دلیل سے بات کرنے کی کوشش کی جائے۔ فیلڈ مشنوں کے دوران میرا واسطہ چند ایسے مردوں سے پڑا ہے جو پختہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کا عقیدہ عورتوں کو گھر سے باہر کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تاہم وہ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ صرف خواتین ڈاکٹروں کو ہی خواتین مریضوں کا علاج کرنا چاہئے۔ ان دونوں متصادم اعتقادات کی غیر عملی حیثیت کا ادراک انہیں اس وقت ہوتا ہے جب کوئی ان سے یہ پوچھتا ہے کہ ''اگر خواتین کو کام نہیں کرنا چاہئے تو پھر آپ یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ آپ کی بیوی یا بیٹی کو مثال کے طور پر بچے کی پیدائش کے دوران کوئی خاتون ڈاکٹر ہی طبی نگہداشت فراہم کرے؟'' اس پر وہ خواتین کے کام نہ کرنے پر اس حد استثناء کی اجازت دے سکتے ہیں کہ چلیں وہ ڈاکٹر بن سکتی ہیں۔ صنفی برابری کے نقطہ نظر سے یہ کوئی مثالی نتیجہ ہرگز نہیں لیکن ایک اہم گفتگو اور بدلتی سوچ کے عمل کا آغاز ضرور ہے۔

پائیدار ترقی کے عالمی مقاصد میں صنفی پہلوؤں کو معیشت کے تمام شعبوں میں ضم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ کی رائے میں اس مقصد کے حصول کے لئے دیگر ملکوں میں کون سے ایسے دیرپا عملی ماڈل ملتے ہیں جنہیں پاکستان میں اپنایا جاسکے؟

پاکستان اس معاملے میں سب سے آگے رہا کہ اس نے پائیدار ترقی کے عالمی مقاصد کو سب سے پہلے اپنایا اور پھر پارلیمنٹ میں اس پر متفقہ قرارداد بھی منظور کی۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اس حوالے سے پاکستان کو کسی دوسرے ملک کی پیروی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حکومت نے وزارت منصوبہ سازی اور تمام صوبوں کے منصوبہ سازی و ترقی کے محکموں کے اندر ہی ایس ڈی جی سپورٹ یونٹ بھی قائم کر دیئے ہیں۔ یعنی اس طرح معاون ادارہ جاتی ڈھانچے بھی وجود میں آرہے ہیں۔ جہاں تک یو این ویمن کا تعلق ہے تو ہمیں خاص طور پر ایس ڈی جی-5 کے حصول میں دلچسپی ہے اور ہم اس میں ہونے والی پیشرفت پر نظر رکھیں گے جبکہ بعض دیگر ایس ڈی جیز پر ہونے والی پیشرفت کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ صنفی برابری اور صنف کے لحاظ سے الگ الگ ڈیٹا کی اہمیت اس حقیقت سے بالکل عیاں ہے کہ ایس ڈی جیز کے کل 167 اشاریئے ہیں جن میں سے تقریباً 25 فیصد میں کوئی صنفی پہلو شامل ہے جس کو دیکھنے کی اور جس کی نگرانی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ترقی کے تمام اہم شعبوں میں باقاعدہ وقفوں کے ساتھ ڈیٹا جمع کرنے پر بھرپور سرمایہ کاری کی ضرورت مسلسل رہے گی۔

یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ تمام صوبوں نے اگرچہ مختلف رفتار اور پیمانے پر سہی لیکن اپنی پروگرام سازی میں صنفی پہلو کو ضم کرنا شروع کر دیا ہے۔ پنجاب جو آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے اور جہاں ادارہ جاتی ڈھانچے اور ریاستی استعداد قدرے زیادہ مضبوط ہیں، صنفی تقاضوں سے ہم آہنگ پروگرام سازی اور جدت آمیز ماڈلز کو آزمانے کے معاملے میں تھوڑا آگے نظر آتا ہے۔ اس میں 'جنڈر مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم' (جی ایم آئی ایس) اور صنفی برابری رپورٹ کا اجراء بھی شامل ہے جو دونوں جنوبی ایشیائی خطے کی اولین مثالیں ہیں۔ ویمن سیفٹی ایپ، ویمن سیفٹی آڈٹ، ویمن آن ویلز اور ون سٹاپ وائلنس اگینسٹ ویمن سنٹر (وی اے ڈبلیو سی) کے قیام کے حوالے سے بھی حکومت پنجاب پیش پیش نظر آتی ہے جو سب کے سب صنفی تقاضوں سے ہم آہنگ ترقیاتی اقدامات کے قابل ذکر ماڈلز ہیں جنہیں اپنانے پر دوسرے صوبوں کو بھی غور کرنا چاہئے۔ دوسری جانب صوبہ سندھ مثال کے طور پر گزرے سالوں کے دوران ایسے قانون وضع کرنے میں زیادہ آگے رہا ہے جو خواتین اور لڑکیوں کے مفادات کو تحفظ دیتے ہیں۔ فی الوقت یہ واحد صوبہ ہے جہاں بچپن کی شادی (18 سال سے پہلے) کی اجازت نہیں ہے۔

دوسرے ملکوں کے کامیاب ماڈلز کو دیکھیں تو ایسے ممالک کا جائزہ لینا مفید رہے گا جنہوں نے اپنی آبادی کے نصف یعنی خواتین کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر معاشی میدان میں عمدہ کارکردگی دکھائی ہے۔ ان میں نارڈک ممالک مثلاً آئس لینڈ اور ناروے شامل ہیں جو نہ صرف امیر ترین ملکوں میں شمار ہوتے ہیں بلکہ صنفی برابری کے اشاریوں میں بھی سب سے آگے ہیں۔ متوسط آمدنی والے ممالک مثلاً مراکش، انڈونیشیا اور ملائشیا کے علاوہ بعض کم ترقی یافتہ ممالک سے بھی اچھی مثالیں مل جاتی ہیں جہاں خواتین کو معاشی طور پر بااختیار بنانے اور ترقیاتی منصوبہ سازی کے عمل میں انہیں شامل کرنے سے خواتین اور ان کی کمیونٹیز کو فائدہ پہنچا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے صوبوں میں صنفی تقاضوں سے ہم آہنگ ترقی پر کام کی شاندار مثالیں مل جاتی ہیں اور ایک دوسرے سے سیکھنے کے بے پناہ مواقع موجود ہیں جن سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔

پاکستان نے چونکہ ایس ڈی جیز کو اپنانے میں پہل کی اس لئے ایس ڈی جیز کے تحت کئے گئے وعدے پورے کرنے کے سفر میں اسے برتری حاصل ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ اسی طرح درست سمت میں بڑھتا رہے اور اس زور کو برقرار رکھے جس میں یو این ویمن اور اقوام متحدہ کا وسیع تر نظام اس کے ساتھ ہے کیونکہ پاکستان کی کامیابی میں ہم سب کا بہترین مفاد پنہاں ہے اور پاکستان کی خواتین اور لڑکیوں نے ہم سے امیدیں لگا رکھی ہیں۔

انٹرویو

معراج ہمایوں خان

رکن صوبائی اسمبلی خیبر پختونخواہ
چیئرپرسن، خواتین پارلیمانی کاکس
خیبر پختونخواہ اسمبلی

مکرر ارشاد

''...خواتین کو پائیدار ترقی اور ماحول کے درمیان تعلق مثلاً آبادی کی افزائش، ہجرت، خاندان میں محنت کی تنظیم، طرز پیداوار و تصرف اور معاشی، سیاسی و سماجی قوت کی غیر مساویانہ تقسیم جیسے معاملات میں مصالحت پیدا کرنے والے ایک کردار کے نقطہ نظر سے دیکھنا ہوگا۔''

خواتین کے لئے مواقع، انتخاب اور استعداد کے اعتبار سے خاطر خواہ بہتری کے باوجود خواتین کے صنفی ترقی انڈکس (جی ڈی آئی) پر پاکستان کا شمار آج بھی دنیا میں سب سے پیچھے رہ جانے والے ملکوں میں ہوتا ہے۔ اس پر قابو پانے کے لئے کن ڈھانچہ جاتی تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ پاکستان کو آج بھی صنفی اختیار کے علاوہ خواندگی اور زچہ کی شرح اموات جیسے اہم سماجی شعبوں میں مقاصد کے حصول سے متعلق اپنی رینکنگ پر شدید تنقید کا سامنا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ماضی قریب میں حکومت نے صنفی ترقی کے تمام شعبوں میں کم سے کم بین الاقوامی معیارات پر پورا اترنے کی کوششیں تیز کر دی ہیں۔ تاہم نتائج بدستور مطلوبہ مقصد سے بہت پیچھے ہیں۔ اس کے اسباب کثیر النوع اور پیچیدہ ہیں۔ ان سب کے ازالہ کے لئے بغور اور گہری سوچ بچار اور منصوبہ سازی کی ضرورت ہے تاکہ تمام تر ترقیاتی چکر اور اس سے جڑے ہر عمل میں مثبت تبدیلیاں آئیں۔ فنڈز کی کمی کے مسئلے پر سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے کیونکہ یہ حکومت کے سیاسی مقاصد اور ترجیحات سے جڑا ہے۔ فنڈز کی کمی عدم دلچسپی اور سیاسی عزم کے فقدان کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ قوانین اور پالیسیوں پر عملدرآمد کے ذمہ دار محکموں کی کارکردگی پر بھی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ فوری لیکن دیرپا نتائج کے لئے ان محکموں کو بہترین تربیت اور اعلیٰ قابلیت کے حامل افسران اور عملے کی ضرورت ہوگی جو اس سب پر یقین رکھتے ہوں جو وہ کر رہے ہیں، ان تمام رکاوٹوں کو سمجھیں جو خواتین کو شمولیت سے روکتی ہیں اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے کام کریں۔

آپ کی رائے میں کیا موجودہ پالیسیاں اور قومی فریم ورک خواتین کو خاطر خواہ حد تک بااختیار بنانے کا کام دیتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ان پالیسیوں پر عملدرآمد میں کون سی رکاوٹیں درپیش ہیں اور اگر نہیں تو کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

حالیہ سالوں میں صنفی اختیار کے اعداد و شمار قومی بحث میں خاصے نمایاں رہے ہیں جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مختلف سطحوں پر خواتین کی شمولیت کے خلاف تعصبات دور ہو رہے ہیں اور خواتین کو اب حکومت کے ترقیاتی مقاصد میں شامل کیا جا رہا ہے۔ خواتین بدستور کام کے زیادہ بوجھ، وسائل کی کمی اور اپنی نقل و حرکت میں رکاوٹوں کے باعث مشکلات کا شکار ہیں۔ سیاسی اور رسول دونوں طرح کے عوامی اداروں نے ابھی وسائل کی تقسیم میں برابری اور دونوں اصناف کے درمیان سماجی ذمہ داریوں میں توازن کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا۔ دستیاب ڈیٹا کی کمی سے حکومت کی لاپرواہی ثابت ہو جاتی ہے۔ قانون سازی ابھی بھی کمزور ہے، صنفی اختیار کی پالیسیاں آج بھی عوامی اداروں میں ناپید نظر آتی ہیں اور ان کے نظام فیصلہ سازی میں خواتین کی شمولیت پر مزاحم دکھائی دیتے ہیں۔ صنفی شعور پیدا کرنے کے لئے استعداد کی بہتری پر بہت زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ فیصلہ ساز اور نگہداشت کرنے والے افراد صنفی اختیار کے منصوبہ کی تشکیل اور اس پر عملدرآمد کے قابل ہو سکیں۔ تبدیلی لانے کی تمام کوششوں میں حائل مذہبی و ثقافتی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے عوامی آگاہی میں بھی اضافہ کی ضرورت ہے۔

قانون ساز اداروں (پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں) میں جہاں خواتین کی نمائندگی خاطر خواہ حد تک بہتر ہوئی ہے وہیں طرز حکمرانی کے دیگر اداروں مثلاً عدلیہ، پولیس اور سول سروس وغیرہ میں وہ آج بھی نمائندگی کی کمی کا شکار ہیں۔ آپ کی رائے میں اس تضاد کا سبب کیا ہے اور اس سلسلے میں کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

حالیہ سالوں میں ہی ایسا ہوا ہے کہ سول سوسائٹی اور عالمی اداروں کے دباؤ کے نتیجے میں حکومت نے خواتین اور ان کے حقوق پر توجہ دینا شروع کی ہے۔ ماضی میں خواتین کہیں نظر ہی نہیں آتی تھیں اور مکمل طور پر اپنے گھر کے مردوں کی محکوم تھیں۔ ناخواندگی اور دیگر ثقافتوں سے شناسائی کی کمی کے باعث خود خواتین بھی اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے بارے میں آگاہی کی کمی کا شکار تھیں۔ لیکن اب یہ سب بدل رہا ہے۔ مواقع، اگرچہ ابھی بھی خاصے کم ہیں، لیکن یہ تیز رفتار افزائش کی راہیں پیدا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اہم محکموں کے ادارہ جاتی استحکام سے ترقی کا عمل مزید تیز ہوگا۔ اداروں کو صنفی تقاضوں اور انسانی حقوق سے زیادہ ہم آہنگ بنانے کے لئے آئینی ترامیم کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ آئین ترامیم کے ذریعے سیاسی جماعتیں جو خواتین کو سیاسی لحاظ سے بااختیار بنانے کا موقع پیدا کرتی ہیں، خواتین کو فیصلہ سازی میں شامل کرنے لگیں گی۔

پاکستان میں ایک طرف معاشیات، سیاسیات اور قانون اور دوسری جانب ثقافت، پدرشاہی نظام اور مذہب کا آپس کا میل جول ایسی منفرد مشکلات پیدا کر دیتا ہے جن کے ہاتھوں اس راہ پر قدم رکھنا کانٹوں پر چلنے کے مترادف ہو جاتا ہے۔ آپس میں جڑے ان محرکین کو کس طرح پہلو بہ پہلو رکھا جائے کہ خواتین کے ساتھ سلوک کے اعتبار سے ایک یکساں سوچ سامنے آسکے؟

پاکستانی معاشرہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ تین قوانین کے تحت چلتا ہے۔ ایک وہ جو ریاست کا ہے، دوسرا جو مذہب سے رہنمائی لیتا ہے اور وہ جو ہر صوبے کی اپنی ثقافت پر مبنی ہے۔ برادری ازم فیصلہ سازی میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور لوگ اس نظام کو ترک کرنے سے گریزاں دکھائی دیتے ہیں چاہے وہ اپنے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لئے بہتر مواقع کی تلاش میں بڑے شہروں میں ہجرت ہی کیوں نہ کر جائیں۔ لڑکیوں کو سکولوں سے اس لئے باہر رکھا جاتا ہے کہ کمیونٹی نے لوگوں کے ذہنوں میں یہ مستقل خوف گاڑ دیا ہے کہ پڑھی لکھی لڑکیاں بہت زیادہ آزاد خیال ہو جاتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کو تو شادی کے لئے کوئی مرد بھی نہیں ملے گا۔ غیرت کو سب سے افضل رکھا جاتا ہے چاہے اس کے لئے خاندان کے کسی عزیز فرد، جو اکثر بیوی، بیٹی یا بہن ہوتی ہے، کی جان کی قیمت ہی کیوں نہ چکانی پڑے۔ خاندان اور علاقے کے بااثر لوگوں کی مخالفت کے سامنے ترقی کا عمل سست ہو جاتا ہے۔

مطلوبہ نتائج تبھی حاصل ہوں گے جب ریاستی قانون (جو مذہب اور ثقافت کے لوازمات کو بھی پیش نظر رکھے) پر سختی سے عملدرآمد ہوگا۔

پائیدار ترقی کے عالمی مقاصد میں صنفی پہلوؤں کو معیشت کے تمام شعبوں میں ضم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ کی رائے میں اس مقصد کے حصول کے لئے دیگر ملکوں میں کون سے ایسے دیرپا عملی ماڈل ملتے ہیں جنہیں پاکستان میں اپنایا جاسکے؟

پائیدار ترقی کے عمل میں سماجی و ثقافتی تبدیلی کی کوشش کی جاتی ہے جس میں وسائل کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہے اور ایسے طریقے اور مقاصد وضع کئے جاتے ہیں جو مردوں اور عورتوں دونوں کے حق میں ہوں۔ اس میں خواتین کا کردار اہم ہے۔ خواتین کو پائیدار ترقی اور ماحول کے درمیان تعلق مثلاً آبادی کی افزائش، ہجرت، خاندان میں محنت کی تنظیم، طرز پیداوار و تصرف اور معاشی، سیاسی و سماجی قوت کی غیر مساویانہ تقسیم جیسے معاملات میں مصالحت پیدا کرنے والے ایک کردار کے نقطہ نظر سے دیکھنا ہوگا۔

ہر ملک کے اپنے ثقافتی اور روایتی اعتقادات ہوتے ہیں۔ طرز زندگی کو سمجھنے کے لئے موزوں تحقیق کرنا پڑتی ہے اور ہر شعبے کے لحاظ سے الگ الگ اعداد و شمار جمع کرنا پڑتے ہیں۔ یہ پائیدار ترقی کی باہم مربوط راہ عمل کے لئے بنیاد کا کام دیتے ہیں جو صنفی برابری سے اعلانیہ وابستگی پر مبنی ہو اور جو خواتین کی صلاحیتیں اور ان کی عزت بہتر بنانے، ان کے حقوق کے تحفظ اور ان کے بلا معاوضہ نگہداشت والے کام کو کم کرنے اور اس کی تقسیم نو کے لئے کام کرے۔ یہ راہ عمل پیدا کرنے کے لئے خواتین کو فیصلہ سازی اور پالیسی تشکیل میں بھرپور اور مساوی شمولیت دینا لازم ہے۔ خواتین کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور مقتدر ڈھانچوں سے باہر رکھا جاتا ہے، خاص طور پر دیہی علاقوں میں جہاں خوراک کی 60 سے 80 فیصد تک پیداوار کے ساتھ ساتھ ایندھن اور پانی کی فراہمی ان کی مرہون منت ہے پھر بھی انہیں ان فطری اثاثوں مثلاً اراضی، پانی اور ماحولیاتی حالات تک برائے نام رسائی یا کنٹرول حاصل ہے جو بہتر زندگی کے مواقع پیدا کرتے ہیں۔ خواتین کی غربت کا سبب صنفی تعصب ہے اور ترقی کی روایتی سوچ اس تعصب کا ازالہ نہیں کرتی۔ درحقیقت یہ ان تعصبات کو تقویت اور رسمی شکل دیتی ہے۔

پاکستان کو اپنے ترقی کے پروگرام میں پائیدار صنفی ترقی پر بھرپور انداز میں بحث کرنی چاہئے اور اپنے پارلیمانی، قانونی اور انتظامی ڈھانچوں کو اس طرز پر ڈھالنا چاہئے کہ یہ عالمی سطح پر دستیاب ڈیٹا اور مہارت سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

انٹرویو

جسٹس (ر) ماجدہ رضوی

چیئرپرسن
انسانی حقوق کمیشن سندھ

خواتین کے لئے مواقع، انتخاب اور استعداد کے اعتبار سے خاطرخواہ بہتری کے باوجود خواتین کے صنفی ترقی انڈکس (جی ڈی آئی) پر پاکستان کا شمار آج بھی دنیا میں سب سے پیچھے رہ جانے والے ملکوں میں ہوتا ہے۔ اس پر قابو پانے کے لئے کن ڈھانچہ جاتی تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟

میرے خیال میں خواتین کے صنفی ترقی انڈکس (جی ڈی آئی) میں بہتری کے لئے درکار سب سے اہم ڈھانچہ جاتی تبدیلیاں محض اس امر کو پوری طرح یقینی بنانے کے لئے ہی نہیں ہونی چاہئیں کہ مختلف قوانین کے تحت مقررہ کوٹہ کو پورا کیا جائے بلکہ کوٹہ میں اضافہ بھی کیا جائے، خاص طور پر بالائی سطح کے تمام سرکاری محکموں کے علاوہ تمام فیصلہ ساز عہدوں پر بھی۔ خواتین کے لئے کوٹہ میں کم از کم 30 فیصد اضافہ ہونا چاہئے۔ ایسے خصوصی ادارے ہونے چاہئیں جہاں خواتین کو تربیت دے کر ان کی مہارتیں اس قدر بہتر بنائی جائیں کہ وہ سرکاری اور نجی سطح پر تمام انتظامی امور نمٹانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہوں۔ یہ ادارے یا کمیشن لازمی طور پر آزادانہ حیثیت میں کام کریں۔

آپ کی رائے میں کیا موجودہ پالیسیاں اور قومی فریم ورک خواتین کو خاطرخواہ حد تک بااختیار بنانے کا کام دیتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ان پالیسیوں پر عملدرآمد میں کون سی رکاوٹیں درپیش ہیں اور اگر نہیں تو کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

ریاستی پالیسیوں کو ہی لے لیں، قومی پالیسی کے میدان میں تمام حوصلہ افزاء اقدامات کے باوجود ان پالیسیوں پر عملدرآمد میں آج بھی لاتعداد مشکلات اپنی جگہ موجود ہیں۔ پہلی، خواتین کے کام کرنے کی بات آئے تو بالعموم لوگوں کے رویئے متعصبانہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارا پدرشاہی سماجی ڈھانچہ ان پالیسیوں پر عملدرآمد میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے کیونکہ مردوں کی ایک بڑی تعداد ابھی بھی خواتین کو اپنے ساتھ کام کرنے والی ساتھی کے طور پر یا اپنے سے اعلیٰ عہدے پر قبول کرنے سے گریزاں ہے۔ شادی شدہ جوڑے کی بات ہو تو شوہر اسے اپنے مردانہ غلبے کے لئے خطرہ سمجھنے لگتا ہے۔ تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی صورتوں میں شوہر اور بیوی کے درمیان اس احساس برتری یا کمتری کے ہاتھوں کئی گھر ٹوٹ گئے۔

سیاسی عزم کی غیر موجودگی بھی ایک بہت اہم عامل ہے۔ اس کی وجہ سے خواتین کو بااختیار بنانے کی پالیسیاں باقاعدہ ڈھانچے کی شکل اختیار نہیں کر پاتیں اور ان پر عملدرآمد میں رکاوٹیں آجاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت سندھ خواتین کے تحفظ اور انہیں بااختیار بنانے کے لئے بحیثیت مجموعی قانون سازی کے شعبے میں پیش پیش رہی ہے۔ لیکن محض قانون سازی کافی نہیں کیونکہ قانون کو صحیح معنوں میں موثر بنانا ہے تو اس پر صحیح معنوں میں سختی سے عملدرآمد ضروری ہے۔

مکرر ارشاد

”... محض قانون سازی کافی نہیں کیونکہ قانون کو صحیح معنوں میں موثر بنانا ہے تو اس پر صحیح معنوں میں سختی سے عملدرآمد ضروری ہے۔“

قانون ساز اداروں (پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں) میں جہاں خواتین کی نمائندگی خاطرخواہ حد تک بہتر ہوئی ہے وہیں طرز حکمرانی کے دیگر اداروں مثلاً عدلیہ، پولیس اور سول سروس وغیرہ میں وہ آج بھی نمائندگی کی کمی کا شکار ہیں۔ آپ کی رائے میں اس تضاد کا سبب کیا ہے اور اس سلسلے میں کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

کئی شعبوں مثلاً عدلیہ کی اعلیٰ عدالتوں میں خواتین نمائندگی کی کمی کا شکار ہیں۔ قانون ساز اداروں میں ان کا انتخاب اسمبلیوں میں پارٹی کی نمائندگی کی بنیاد پر ہوتا ہے اور جنرل نشستوں پر بہت کم خواتین سامنے آتی ہیں۔ سیاسی جماعتوں میں داخلی انتخابات نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ اپنی خواتین امیدواروں کی مالی مدد کرتی ہیں۔ بارہا، خواتین امیدواروں کو مردوں کے مقابلے میں یکساں مواقع بھی فراہم نہیں کئے جاتے جبکہ مردوں کو زیادہ سماجی آزادی حاصل ہوتی ہے، وہ زیادہ جہان شناس ہوتے ہیں اور معاشی لحاظ سے بھی بہتر ہوتے ہیں جس سے ملے ہوتا ہے کہ وہ خواتین کے مقابلے میں زیادہ ماہر اور اہل ہیں۔ اس مسئلے سے نمٹنے اور خواتین کی نمائندگی برابر لانے کے لئے ضروری ہے کہ ان سماجی و سیاسی و مذہبی اور معاشی رکاوٹوں کو دور کرنے کی حتی الوسع کوششیں کی جائیں جو خواتین کو بااختیار بنانے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

اس عدم مساوات کو مذکورہ بالا ڈھانچہ جاتی تبدیلیوں کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے۔ خواتین کو مالی لحاظ سے خودمختار بنانا ہوگا تاکہ انہیں خاندان میں ایک حیثیت مل سکے۔ اس سے ان کے اندر اعتماد پیدا ہوگا کہ وہ پدرشاہی سوچ، ثقافت اور مذہب کی رکاوٹوں پر قابو پا سکیں۔ علاوہ ازیں، اپنا کاروبار کرنے والی یا خواتین انٹرپرینیورز کو سرمایہ اور تکنیکی معاونت فراہم کر کے ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے کہ وہ اپنے کاروباری خیالات کو عملی جامہ پہنا سکیں جس سے ان کا اعتماد بہتر ہوگا اور انہیں قدامت پسندانہ سماجی اقدار سے نمٹنے میں مدد ملے گی۔ مزید برآں، خواتین کو تشدد کے خلاف تحفظ دینے سے معاشی سرگرمیوں میں خواتین کی شمولیت میں نمایاں اضافہ ہو سکتا ہے۔

قصہ مختصر، ریاست کو اپنے اندر عزم پیدا کرنا ہوگا کہ قوانین اور پالیسیوں کو کامیاب بنانے کے لئے ان کی صحیح معنوں میں پیروی کی جائے اور ان پر عملدرآمد کیا جائے۔

ڈاکٹر یاسمین زیدی

ڈائریکٹر
سنٹر آف جنڈر اینڈ پالیسی سٹڈیز

مکرر ارشاد

"...انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق پر مذہب یا رسم و رواج کا لیبل لگانے کے بجائے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان پر بالکل واضح سوچ سے رہنمائی لیتے ہوئے انہیں سمجھا جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔"

خواتین کے لئے مواقع، انتخاب اور استعداد کے اعتبار سے خاطرخواہ بہتری کے باوجود خواتین کے صنفی ترقی انڈکس (جی ڈی آئی) پر پاکستان کا شمار آج بھی دنیا میں سب سے پیچھے رہ جانے والے ملکوں میں ہوتا ہے۔ اس پر قابو پانے کے لئے کن ڈھانچہ جاتی تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟

ایک بنیادی تبدیلی اس حوالے سے ضروری ہے کہ قوانین ہوں یا پالیسیاں یا محض میڈیا، یہ خواتین کو کس طرح دیکھتے اور مخاطب کرتے ہیں۔ آبادی کا نصف ہونے کے ناطے خواتین کی صحت، تعلیم، کام، سیاست وغیرہ، یہ سب باتیں پاکستان کی ترقی کی تشکیل میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ میرے خیال میں خواتین کی زندگیاں بہتر بنانے کے لئے انہیں تعلیمی اور معاشی اعتبار سے بااختیار بنانا بہت اہم ہے۔ پاکستان کو یہ کمی دور کرنے کے لئے تعلیم اور صحت پر خاطرخواہ سرمایہ کاری کرنی چاہئے۔

خواتین کو اپنی استعداد بروئے کار لانے کے قابل بنانے میں ایک بڑی رکاوٹ گھر، گلی یا کام کرنے کی جگہ پر تشدد کا ڈر یا خوف ہے۔ خواتین کے خلاف تشدد کو قطعی برداشت نہ کرنے کی پالیسی انہیں مواقع تک رسائی دینے کے لئے ناگزیر ہے۔

معیشت میں خواتین کے کردار اور اس سلسلے میں سب سے پہلے بلا معاوضہ گھریلو مشقت کو تسلیم کرنا ہوگا اور اسے حکومتی پالیسیوں میں جگہ دینا ہوگی۔ زراعت اور لائیوسٹاک میں ان کے معاشی کردار میں معاونت کے لئے ایسی پالیسیاں اور اقدامات وضع کرنا ہوں گے جو اس کردار کو بہتر بنائیں۔ گزربسر کے لئے کاشت کار کے طور پر کام کرنے والی خواتین خوراک کی سلامتی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ چھوٹے کاشت کاروں اور لائیوسٹاک مالکان کو بے رحم، کارپوریٹ زراعت اور کاروباری اداروں سے تحفظ دینے والے ریگولیٹری فریم ورک انتہائی ضروری ہیں۔ خاص طور پر اراضی کی ملکیت کے معاملے میں اثاثوں کی منتقلی ہونی چاہئے۔

آپ کی رائے میں کیا موجودہ پالیسیاں اور قومی فریم ورک خواتین کو خاطرخواہ حد تک بااختیار بنانے کا کام دیتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ان پالیسیوں پر عملدرآمد میں کون سی رکاوٹیں درپیش ہیں اور اگر نہیں تو کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

جہاں تک موجودہ پالیسیوں میں خواتین کو خاطرخواہ حد تک بااختیار بنانے کی بات ہے تو اس کا جواب ہاں اور نہیں دونوں میں ہے۔ گزشتہ دہائی کے دوران قانون سازی اور پالیسی کے شعبوں میں جو خواتین دوست اقدامات ہوئے ہیں ان سے پہلے بھی پالیسی کے میدان میں خلاء نہیں تھا۔ مسئلہ ان پالیسیوں کو سمجھنے اور ان پر عملدرآمد کا ہے۔ مثال کے طور پر آئین صنف کی بنیاد پر امتیاز نہیں برتتا اور تمام پالیسی اور قومی فریم ورکس کے لئے اسے رہنما اصول کا کام دینا چاہئے۔ پھر بھی صنف سے بے بہرہ یا صنف کے معاملے میں غیر جانبدار پالیسیوں کو تقویت دینے والے ٹھوس اقدام کی ضرورت ہے۔

دوسری جانب ابھی بہت کام کرنا باقی ہے، عین اس بناء پر کہ ہماری پالیسی سازی صنف سے بے بہرہ ہے۔ اس کی ایک مثال ہماری معاشی پالیسیاں ہیں کیونکہ اس بارے میں شاید ہی کوئی تجزیہ کیا جاتا ہے کہ خواتین اور محروم طبقات ان پالیسیوں سے کس طرح متاثر یا خارج ہوتے ہیں۔ پنج سالہ منصوبے، جو منصوبہ سازی کی قومی پالیسی دستاویز ہیں، میں خواتین کو بااختیار بنانے یا صنف اور ترقی پر ایک باب نوے کی دہائی کے اوائل میں اس وقت شامل کیا گیا جب خواتین کے گروپوں نے اس اہم دستاویز میں ایسا کوئی موضوع نہ ہونے کا مسئلہ دور کرنے کے لئے خوب دوڑ دھوپ کی۔ تاہم اسے محض ایک باب بنا کر رکھ دیا گیا ہے اور اس دستاویز میں خواتین کا ذکر کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتا۔

وسائل کی کمی عملدرآمد میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ پالیسی کتنی اچھی کیوں نہ ہو، مادی اور انسانی وسائل کے بغیر یہ محض کاغذ کا ٹکڑا رہ جاتی ہے۔ وسائل کے ساتھ ہی ذمہ داران اور شہریوں میں اس بارے میں آگاہی کا عنصر بھی جڑا ہے کہ ان قوانین اور پالیسیوں کو عملی شکل کس طرح دی جاسکتی ہے۔

قانون ساز اداروں (پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں) میں جہاں خواتین کی نمائندگی خاطرخواہ حد تک بہتر ہوئی ہے وہیں طرز حکمرانی کے دیگر اداروں مثلاً عدلیہ، پولیس اور سول سروس وغیرہ میں وہ آج بھی نمائندگی کی کمی کا شکار ہیں۔ آپ کی رائے میں اس تضاد کا سبب کیا ہے اور اس سلسلے میں کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

سادہ سی بات ہے۔ سرکاری شعبے میں تمام بھرتیاں میرٹ پر ہونی چاہئیں اور خواتین کے لئے کوٹہ ہونا چاہئے۔ مثلاً ملک کے ہر پولیس سٹیشن میں کم و بیش دو سے تین خواتین پولیس افسران کیوں نہیں ہیں؟ اس سے نہ صرف تھانوں میں خواتین کی تعداد میں اضافہ ہوگا بلکہ ان تک خواتین کی رسائی زیادہ بہتر ہو جائے گی۔ یہی بات عدلیہ اور سول سروس پر صادق آتی ہے۔ بھرتی کا عمل ہو یا تربیت اور ترقی کا مطلوبہ معیار یا پھر کام کرنے کا ماحول، سب مردوں کے لئے بنے ہوئے ہیں۔

پاکستان میں ایک طرف معاشیات، سیاسیات اور قانون اور دوسری جانب ثقافت، پدرشاہی نظام اور مذہب کا آپس کا میل جول ایسی منفرد مشکلات پیدا کر دیتا ہے جن کے ہاتھوں اس راہ پر قدم رکھنا کانٹوں پر چلنے کے مترادف ہو جاتا ہے۔ آپس میں جڑے ان محرکین کو کس طرح پہلو بہ پہلو رکھا جائے کہ خواتین کے ساتھ سلوک کے اعتبار سے ایک یکساں سوچ سامنے آسکے؟

ادارے ہر جگہ پدرشاہی نظام میں لپٹے ہیں۔ یہ پوری دنیا میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ پاکستان میں یہ بات اس بناء پر زیادہ درست ہو جاتی ہے کہ ہماری ثقافت میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ خواتین کا کام گھر بنانا اور ماں کا کردار نبھانا ہے۔ یہی سوچ قوانین اور پالیسیوں کی تشریح اور عملدرآمد میں بھی سرایت کر جاتی ہے۔ خواتین کی معاشی شمولیت بہتر بنانے

کی برائے نام پالیسیاں اس کردار کی عکاسی کرتی ہیں۔خواتین کے لئے مہارتوں کی تربیت کے ادارے آج بھی خواتین کو محض سلائی کڑھائی کے کورس کراتے نظر آتے ہیں۔زراعت اور لائیوسٹاک میں خواتین کے نمایاں کردار سے چشم پوشی برتی جاتی ہے اور اس بارے میں اگر کوئی توجہ دی جاتی ہے تو وہ برائے نام سی ہے کہ اس کردار کو کس طرح مستحکم اور بہتر بنایا جائے۔خواتین کے کام اور زندگیوں سے متعلق ان روایتی مفروضوں اور ان کے اصل حقائق کو الگ الگ کرنے کی کوششوں کے سلسلے میں ہر سطح پر ایک پائیدار مہم کی ضرورت ہے جس کے ذریعے سول ملازمین، پالیسی سازوں اور ذمہ داران میں اس حقیقت کے بارے میں شعور و آگاہی پیدا کی جائے۔

ایک اور بات۔ہمیں اس بات کو سمجھنا ہوگا کہ پدرشاہی نظام، ثقافت اور مذہب، پاکستان میں ان سب کی کڑیاں آپس میں مضبوطی سے جڑی ہیں اور ثقافتی طور طریقوں کو اکثر مذہب کے نام پر جائز بنا دیا جاتا ہے۔ان پر مذہب یا رسم و رواج کا لیبل لگانے کے بجائے ضرورت اس امر کی ہے کہ انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق پر بالکل واضح سوچ سے رہنمائی لیتے ہوئے انہیں سمجھا جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔

پائیدار ترقی کے عالمی مقاصد میں صنفی پہلوؤں کو معیشت کے تمام شعبوں میں ضم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔آپ کی رائے میں اس مقصد کے حصول کے لئے دیگر ملکوں میں کون سے ایسے دیرپا عملی ماڈل ملتے ہیں جنہیں پاکستان میں اپنایا جاسکے؟

اہداف اور اشاریوں کے تحت پائیدار ترقی کے عالمی مقاصد پر عملدرآمد پاکستان کے لئے ایک بڑا چیلنج ہوگا۔شروعات کے طور پر ترجیحی شعبوں کی نشاندہی کے موجودہ عمل سے خواتین اور ان کے خدشات کی موزوں طور پر عکاسی نہیں ہوتی۔ہم ایسی کاوشوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں جن کا تعلق پائیدار ترقی کے مختلف عالمی مقاصد سے ہے اور جن کے ذریعے پاکستان میں صنفی خدشات کو کامیابی سے دور کیا گیا ہے۔جنوبی ایشیا میں علاقائی سطح پر اور عالمی سطح پر جو کچھ ہو چکا ہے اس کے جائزہ سے بھی پاکستان کو ماڈل مل سکتے ہیں۔پائیدار ترقی کا پانچواں عالمی مقصد خاص طور پر خواتین کو بااختیار بنانے کی بات کرتا ہے اور اس ضمن میں معاشی طور پر بااختیار بنانے اور خواتین کے خلاف تشدد کے ازالہ کے اثر انگیز اقدامات پر توجہ دی جانی چاہئے۔سرکاری شعبے کے اخراجات سے بھی خواتین کی کام کرنے کی استعداد اور ان کی سماجی فلاح بہتر بنانے کی ترجیحات کی عکاسی ہونی چاہئے۔